یکم و ۱۶ مئی ۲۰۲۴ء | بسم اللہ الرحمٰن الرحیم | جلد نمبر: ۱۷ ۔ شمارہ نمبر: ۹۔۱۰

پندرہ روزہ
معارف فیچر کراچی
MA'ARIF FEATURE

مدیر:
سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، سید سمیع اللہ حسینی، نوید نون ۔ معاون مدیران: غیاث الدین، محمد عمید فاروقی

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰
فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱۔۳۶۳۴۹۸۴۰ (۹۲۔۲۱)
برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

۱ ۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے، جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔
۲ ۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلاتبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون، نقطہء نظر، خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں، اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔
۳ ۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔
۴ ۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید، لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔
۵ ۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

بھارتی معیشت میں کتنا دَم خم ہے؟

بھارت کے وزیرِ اعظم نریندر مودی مسلسل تیسری بار وزیرِ اعظم منتخب ہونے کی منزل کے نزدیک کھڑے ہیں۔ ایک ڈیڑھ ماہ میں فیصلہ ہو جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ پنڈت جواہر لعل نہرو کے بعد وہ بھارت کے مضبوط ترین لیڈر بن کر ابھرے ہیں۔ چائے کا اسٹال چلانے والے کا بیٹا اپنی سیاسی حیثیت منوانے میں حیرت انگیز حد تک کامیاب رہا ہے۔ اُن کا ہندو قوم پرستی کا نظریہ بھی غیر معمولی مقبولیت اور کامیابی سے ہم کنار رہا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ جمہوری اداروں کی تاثیر کم کرنے میں بھی کامیاب رہے ہیں۔ جمہوریت میں سب کو ساتھ لے کر چلنا پڑتا ہے مگر نریندر مودی نے اکثریت کے بل پر من مانی کو ترجیح دی ہے۔ مجموعی طور پر عوام اور اشرافیہ سبھی میں یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ وہ بھارت کو زیادہ طاقت اور زیادہ خوش حالی کی طرف لے جا رہے ہیں۔

نریندر مودی کا بھارت اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ کس طور ایک مضبوط شخصیت کی قیادت میں کوئی ملک عالمگیریت کے گھٹتے ہوئے اثرات کے اس دور میں بھی تیزی سے زیادہ متمول ہو سکتا ہے۔ اگر بھارت اِسی رفتار سے ترقی کرتا رہا اور اگلے دس سے بیس برس تک بدامنی کو بہت حد تک ٹالنے میں کامیاب رہا تو ایک ارب چالیس کروڑ افراد کا مقدر متوازن رہے گا۔

اس وقت ذہنوں میں بہت سے سوال ابھر رہے ہیں۔ کیا بھارت اپنی ترقی کی رفتار برقرار رکھ سکے گا؟ اور کیا ترقی ہی کرتا رہے گا؟ کیا اُس کی راہ میں اب کوئی دیوار حائل نہیں ہوگی؟ کیا نریندر مودی کی قیادت میں بھارت نے اپنے تمام مسائل پر قابو پا لیا ہے؟ کیا بھارت کی ترقی کے تواتر کا مدار اس بات پر ہے کہ نریندر مودی اقتدار میں رہیں؟ کیا کسی اور کی قیادت میں بھارت زیادہ اور بھرپور ترقی نہیں کر پائے گا؟ مغربی میڈیا میں بھارت کے معاشی امکانات کے بارے میں تجزیوں کا بازار گرم ہے۔ معروف برطانوی جریدے دی اکنامسٹ نے بھارت کی معاشی پیش رفت کے حوالے سے متعدد تجزیے کیے ہیں۔ ان تجزیوں میں مختلف آرا پیش کی گئی ہیں۔ یہ سوال بھی اٹھایا گیا ہے کہ بھارت کی مجموعی ترقی سے کیا بھارت کے ہر باشندے کو بہتر زندگی بسر کرنے کا موقع مل سکے گا؟ کیا وہاں تمام برادریوں کے حقوق کا تحفظ ممکن ہو سکے گا؟

اس وقت بھارت سب سے زیادہ سے تیزی سے ترقی کرنے والے بڑے ممالک میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی شرحِ نمود بڑھتے بڑھتے ۶ تا ۷ فیصد سالانہ تک جا پہنچی ہے۔ نئے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ نجی شعبے کا اعتماد ۲۰۱۰ء کے بعد سے اب تک کی بلند ترین سطح پر ہے۔ اس وقت بھارت پانچویں بڑی معیشت ہے۔ ۲۰۲۷ء تک بھارت تیسرے نمبر تک پہنچ سکتا ہے۔ اس وقت بھارت جس انداز سے دنیا بھر میں اپنے اثرات کا دائرہ وسیع کر رہا ہے اُس سے بہت کچھ سامنے آ رہا ہے۔ امریکا، چین اور یورپ کے متعدد ممالک کے لیے بھی وہ خطرہ بنتا جا رہا ہے۔ بھارت میں امریکی کاروباری اداروں کا عملہ اب ۱۵؍لاکھ نفوس تک پہنچ چکا ہے۔ کسی بھی اور ملک میں امریکی کاروباری اداروں کا اتنا عملہ نہیں۔ بھارت کی اسٹاک مارکیٹ عالمی رینکنگ میں چوتھے نمبر پر ہے۔ ہوابازی کا شعبہ تیسرے نمبر پر ہے۔ روس سے خام تیل خریدنے کے نتیجے میں عالمی منڈی میں خام تیل کی قیمتیں متاثر ہوتی ہیں۔ بھارت کی مالی حیثیت کا بلند ہونا اس بات کا اشارہ ہے کہ عالمی سیاست میں بھی اس کی پوزیشن مضبوط ہوتی جا رہی ہے۔ جب یمن کے حوثیوں نے نہرِ سوئیز میں جہاز رانی کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کیں تو بھارت نے ۱۰؍جنگی جہاز مشرقِ وسطیٰ کے پانیوں میں پہنچا دیے۔ امریکی صدور جو بائیڈن اور ڈونلڈ ٹرمپ نے بھارت کے متعدد معاملات میں غیر جانب دار رہنے کو ترجیح دی ہے۔

اگر آپ کو مینوفیکچرنگ کی بنیاد پر کسی معجزے کی سی کیفیت کا انتظار ہے تو بھارت کسی بھی طور اگلا چین نہیں ہے۔ بھارت اس وقت صنعتی پیداوار کے اعتبار سے کمزور ہے۔ اشیا کی تجارت زیادہ نہیں اور کارخانوں میں آٹومیشن برائے نام ہے۔ ایسے میں لازم ہے کہ صنعتی پیداوار بڑھانے کی خاطر معاشی نمو کا نیا ماڈل اپنایا جائے۔ بنیادی ڈھانچے کی توسیع ناگزیر ہے۔ ایسا بنیادی ڈھانچا تشکیل دینے کی ضرورت ہے جو ملک بھر کے پیداواری مراکز کو ایک وسیع مرکز سے جوڑ دے۔

بھارت میں اس وقت ۱۴۹؍ایئر پورٹ ہیں۔ ایک عشرہ قبل اس سے نصف تھے۔ بھارتی قیادت ملک بھر میں مزید

اندرونی صفحات پر

- فضائی حادثے میں ایرانی صدر کی رحلت
- ٹرمپ کو مجرم قرار دینے کا فیصلہ انتخابات پر اثر انداز ہوگا؟
- ناروے ''آزاد فلسطین تحریک'' کا مرکز کیسے بنا؟
- امریکی انتخابات میں ''تیسری جماعت'' کی اہمیت
- واٹر گیٹ اسکینڈل، گتھی کبھی سلجھے گی؟
- کیا بھارت کی آبادی میں مسلمانوں کا حصہ بڑھا ہے؟
- بھارت، ایران چابہار معاہدہ اور امریکی دھمکی
- بھارتی انتخابات میں مصنوعی ذہانت کا استعمال
- مودی کے انتخابی مہم کے دوران ۸۰؍انٹرویو
- امریکیوں کا ''جمہوری مزاج''
- برآمدات میں اضافہ پاکستانی معیشت۔۔

۱۰ہزار کلومیٹر کی سڑکیں بنوا رہی ہے۔ نیشنل گرڈ میں ۱۵گیگاواٹ بجلی داخل کی جارہی ہے۔ یہ بجلی سولر پینلز سے پیدا کی جائے گی۔ بنیادی ڈھانچے کا بڑا حصہ غیر مرئی ہے یعنی دکھائی نہیں دیتا۔ مثلاً ڈیجیٹل پے مینٹ سسٹم، ماڈرن کیپٹل مارکیٹس اور بینک۔ یونیفائیڈ ڈیجیٹل ٹیکس سسٹم بھی لایا جارہا ہے۔ یہ پورا بنیادی ڈھانچا کاروباری اداروں کو ڈھنگ سے کام کرنے کے سلسلے میں غیر معمولی معاونت فراہم کرتا ہے۔

بھارتی معیشت نے خدمات کی برآمد پر زیادہ توجہ دی ہے۔ خدمات کی برآمدات اب خام قومی پیداوار (جی ڈی پی) کے ۱۰فیصد کے مساوی ہیں۔ عالمی تجارتِ اشیا میں بھی بھارت اپنی پوزیشن بہتر بنا رہا ہے۔ بھارت کے بہت سے ادارے اس وقت گلوبل کیپیبلیٹی سینٹر کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ یہ ادارے کثیر الملکی اداروں کو تحقیق و ترقی اور قانون و حساب داری وغیرہ کے شعبے میں خدمات فراہم کرتے ہیں۔

بھارت کے تعلیمی اداروں میں ہائی ٹیک پر بھی توجہ دی جارہی ہے۔ اعلیٰ تعلیم و تربیت کے ادارے بڑھ چڑھ کر کام کر رہے ہیں مگر پھر بھی اب تک نصف سے زائد بھارت مکمل طور پر دیہی انداز کا ہے۔ بھارت بھر میں کروڑوں افراد مستقل بنیاد پر ڈیجیٹل پلیٹ فارمز کی مدد سے امدادی رقوم حاصل کر رہے ہیں۔ نئے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۰۱۷ء کی قیمتوں کی سطح پر یومیہ ۲ء۱۷ڈالر فی کس آمدنی کی بنیاد پر زندگی بسر کرنے والے بھارتی باشندوں کی تعداد میں ۲۰۱۱ء کے ۱۲فیصد کے مقابلے میں ۵ فیصد کمی آئی ہے۔

ایک اہم سوال یہ ہے کہ بھارت کی اس شاندار ترقی کا کریڈٹ نریندر مودی کو کس حد تک دیا جاسکتا ہے۔ ان کی بیشتر کامیاب پالیسیوں کا ماخذ ۱۹۹۰ء اور ۲۰۰۰ء کی دہائیوں کے دوران بھارت میں اپنائی جانے والی لبرل پالیسیوں کی دَین ہے۔ مگر خیر، اس میں کوئی قباحت بھی نہیں۔ نریندر مودی کو اس بات کا کریڈٹ ضرور جاتا ہے کہ انہوں نے معاشی اصلاحات کے نفاذ پر توجہ دی، فیصلوں کی تعمیل پر خود متوجہ رہے اور بیورو کریسی میں اپنے مخالفین سے اچھی طرح نپٹنے میں کامیاب رہے ہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ نریندر مودی نے ایسے سرمایہ دارانہ نظام کو فروغ دیا ہے جس میں بہت کچھ الٹا پلٹا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ چند بڑے اداروں کو حکومت کی زیادہ حمایت و تعاون حاصل ہے، پھر بھی یہ ماننا ہی پڑے گا کہ اس بات پر زور رہا ہے کہ دولت چند ہاتھوں میں مرتکز ہو کر نہ رہ جائے۔ کرپشن کا گراف نمایاں حد تک گرا ہے اور کاروباری سرگرمیاں بھرپور توانائی اور آب و تاب کے ساتھ جاری ہیں۔

تنوع برقرار رکھنے پر بھی توجہ دی جارہی ہے۔ نریندر مودی عوامی شخصیت بھی ہیں اور ایک سی ای او بھی۔ وہ جس طور جلسوں اور جلوسوں میں شریک ہوتے ہیں بالکل اُسی طور پاور پوائنٹ پریزنٹیشنز میں بھی دلچسپی لیتے ہیں۔ اگر وہ مزید پانچ سال کے لیے منتخب ہوتے ہیں تو اس میں کوئی شک نہیں کہ بھارت خوب ترقی کرے گا۔ بھارت میں متوسط طبقہ بھی پروان چڑھتا رہے گا۔ اس وقت بھارت میں کم و بیش ۶ کروڑ افراد سالانہ ۱۰ہزار ڈالر سے زیادہ کماتے ہیں۔ ۲۰۲۷ء تک ایسے افراد کی تعداد ۱۰کروڑ ہوجائے گی۔ یہ اندازہ گولڈ مین سیش کا ہے۔ اس بینک کا ۲۰ فیصد عملہ بھارت میں ہے۔

اِن ساری کامیابیوں اور خوبیوں کے باوجود بھارت کو ایک بہت بڑے مسئلے کا سامنا ہے۔ ملک بھر میں ایک ارب سے زائد افراد کام کرنے کی عمر کے ہیں اور ان میں سے صرف ۱۰کروڑ رسمی نوعیت کی ملازمت کر پا رہے ہیں۔ باقی ۹۰ کروڑ میں سے بیشتر یا تو کبھی کبھار کام کر پاتے ہیں یا پھر بے روزگاری کا عذاب جھیلتے ہیں۔ نریندر مودی کو بھی اس بات کا احساس ہے کہ ملک میں بے روزگاری کا گراف اطمینان بخش حد تک نہیں نیچے نہیں آرہا۔ اُنہوں نے افرادی قوت کو کھپانے کے لیے حکومت کی سطح پر ایک ایسا منصوبہ شروع کرنے کو ترجیح دی ہے جس کے ذریعے مینوفیکچرنگ سیکٹر کو فروغ دیا جائے۔ اس سیکٹر کو فروغ دینے سے لوگوں کو کام پر لگانے میں مدد ملے گی۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ اگر اس منصوبے کو مطلوب حد تک کامیابی مل بھی گئی تو صرف ۷۰ لاکھ ملازمتیں پیدا ہوسکیں گی۔ اور اگر چین کے صدر شی جن پنگ کی طرف سے برآمدات میں اضافے کی کوششوں کو کامیابی مل گئی تو نریندر مودی کا یہ منصوبہ کامیابی کی منزل سے بہت دور ہوجائے گا۔

اگر بھارتی معیشت کو فروغ پانا ہے، مضبوط سے مضبوط تر ہونا ہے تو لازم ہے کہ بڑے پیمانے پر روزگار کے مواقع کا بھی اہتمام کیا جاتا رہے۔ ایک بڑا راستہ تو یہ ہے کہ ڈیجیٹائزڈ دنیا کے لیے مرکز کے طور پر کام کیا جائے۔ ساتھ ہی ساتھ چند ایسی صنعتوں کو فروغ دینے کی ضرورت ہے جو برآمدی شعبے سے جُڑی ہوئی ہوں۔ ڈیجیٹل فائنانس، خوراک اور دفاع کے شعبوں پر متوجہ ہونے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں امریکا سے مضبوط روابط بہت معاون ثابت ہوں گے۔

نئے صنعتی شعبوں میں کام کرنے والوں کو ملنے والی اُجرتیں جب خرچ ہوں گی تو نئے شعبوں کو تقویت ملے گی۔ یوں تعمیرات سے ہوٹلنگ تک بہت سے شعبوں کو پروان چڑھایا جاسکے گا۔ ملک کی موثر واحد مارکیٹ پیداوار کا گراف بلند کرے گی اور بہترین اہداف کے تعین سے اُن لوگوں کی بہبود یقینی بنانے میں مدد ملے گی جو ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہیں۔ اس کے لیے بھارت کو تعلیم اور زراعت دونوں ہی شعبے تبدیل یا اپ گریڈ کرنا پڑیں گے اور شمال کے گنجان آباد علاقوں سے جنوب اور مغرب کے شہروں کو نقل مکانی یقینی بنانا پڑے گی۔

اِن معیارات کو ذہن نشین رکھتے ہوئے بات کی جائے تو نریندر مودی کے پاس کہنے کو کچھ زیادہ نہیں۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کے پاس ٹیلینٹ بھی ہے اور نئے آئیڈیاز بھی مگر وہ اب تک انتہا پسندی اور مسلم دشمنی تک محدود رہی ہے۔ سیاست میں لبرل ازم کا گراف نیچے آیا ہے جس کے نتیجے میں سیاسی مخالفت گھٹی ہے، اپوزیشن کا کردار محدود ہوا ہے اور اظہارِ رائے کی آزادی پر کاری ضرب لگی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو اُس خوف کی موجودگی کو ثابت کرتی ہے جو نریندر مودی کو سمجھنا چاہیے کہ سرمایہ کاری کیوں گھٹ رہی ہے۔ ۲۰۳۰ء کے عشرے میں عوام کو ایک بہت بڑی سماجی تبدیلی کے لیے تیار کرنے کے لیے تیاری کا عمل اب تک شروع نہیں کیا جاسکا ہے۔ تعلیم، زراعت اور شہروں کی تشکیلِ نو کے لیے بھارتیہ جنتا پارٹی کو اُن ریاستوں کا بھی تعاون درکار ہوگا جہاں دیگر جماعتوں کی حکومت ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اِس وقت انتشار کا سامنا کرنے والے سماجی حلقوں کا اشتراکِ عمل بھی لازم ہے جنہیں نریندر مودی کی مکروہ و ناگوار سیاست نے بے راہ کردیا ہے۔

ایک اہم سوال یہ ہے کہ بھارت کے لیے نریندر مودی کیا ہیں؟ لی کوآن یُو، یا طیب ایردوان؟

بھارت اور اُس کی ہیوی ویٹ معیشت کے لیے بنیادی سوال یہ نہیں ہے کہ نریندر مودی جیتیں گے یا نہیں بلکہ یہ ہے کہ وہ اپنا فکری ارتقا یقینی بنا سکیں گے یا نہیں۔ اب وہ ۷۳ سال کے ہیں۔ ایسے میں ملک کے بیشتر معاملات کے نظم و نسق کی صلاحیت و سکت اُن میں گھٹ چکی ہے۔ ۱۹۹۰ء کے عشرے میں سامنے آنے والی معاشی اصلاحات سے مطابقت رکھنے والا اصلاحاتی ایجنڈا تیار کرنے اور سوچنے والوں کو نوازنے والی، تیزی سے پنپتی ہوئی نالج اکانومی میں پنپنے کے لیے لازم ہے کہ نریندر مودی خود سَری ترک کریں۔ بہت بڑے پیمانے پر ملکی اور بیرونی سرمایہ کاری کے حصول اور معاشی نمو کی ذہنیت کے ساتھ کامیابی یقینی بنانے کے لیے بھارتیہ جنتا پارٹی کو نفرت اور تنگ نظری کی سیاست ترک کرنا ہوگی۔ اگر ایسا نہ ہوا تو نریندر مودی کا قومی احیا کا مشن اپنے وعدوں کی تکمیل میں ناکام رہے گا۔۔۔ (ترجمہ: ابوصباحت)

"How strong is India's economy?"
("The Economist". April 25, 2024)

فضائی حادثے میں ایرانی صدر کی رحلت

ہیلی کاپٹر حادثے میں ایران کے صدر، وزیرِ خارجہ اور دیگر حکام کی وفات کے بعد مشرقِ وسطیٰ کے موجودہ حالات کے پس منظر میں خطے پر اس واقعے کے ممکنہ اثرات بین الاقوامی میڈیا میں بحث کا موضوع ہیں۔

خبر رساں ادارے 'ایسوسی ایٹڈ پریس' نے ہیلی کاپٹر حادثے میں ابراہیم رئیسی کی وفات کے بعد اپنی ایک رپورٹ میں امکان ظاہر کیا کہ اس واقعے کی گونج مشرقِ وسطیٰ میں سنی جائے گی۔ گزشتہ دنوں شائع ہونے والی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ خطے میں جاری کشیدگی گزشتہ ماہ عروج پر پہنچ گئی تھی جب ابراہیم رئیسی اور ایران کے رہبرِ اعلیٰ نے شام میں ایرانی قونصلیٹ پر ایک حملے میں دو ایرانی جنرلوں اور دیگر اہل کاروں کی ہلاکت کے جواب میں اسرائیل پر سیکڑوں ڈرونز اور بیلسٹک میزائلوں سے حملہ کیا تھا۔

اسرائیل نے اپنے اتحادیوں کی مدد سے ایران کی جانب سے لانچ کیے گئے زیادہ تر ڈرونز اور میزائل مار گرائے تھے۔ اس کارروائی کے جواب میں اسرائیل نے ایران کے شہر اصفہان میں فضائی دفاع کے ریڈار سسٹم کو نشانہ بنایا تھا۔ اس کارروائی میں کوئی ہلاکت نہیں ہوئی تھی۔ ایران اور اسرائیل کے درمیان گزشتہ کئی برسوں کے دوران خفیہ آپریشنز اور سائبر حملوں کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ تاہم رواں برس اپریل میں پہلی مرتبہ دونوں حریف ممالک نے ایک دوسرے کے خلاف براہِ راست اپنی عسکری قوت کا استعمال کیا تھا۔

اسرائیل اور حماس کے درمیان جاری جنگ کی وجہ سے خطے میں دیگر اتحادی بھی تنازعات میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں اور مسلسل اس جنگ کو وسعت دینے کی دھمکی دیتے رہے ہیں۔ اس وقت لبنان، شام، عراق، یمن اور فلسطینی علاقوں میں ایران کے حمایت یافتہ کئی گروپس موجود ہیں جن کو تہران امریکا اور اسرائیل کی جانب سے کسی بھی ممکنہ کارروائی میں ڈھال کے طور پر استعمال کر سکتا ہے۔ مشرقِ وسطیٰ میں جاری تناؤ کے ماحول میں اعلیٰ حکومتی شخصیات کو لے جانے والے ہیلی کاپٹر کے حادثے جیسا کوئی غیر معمولی واقعہ آئندہ غیر متوقع صورتِ حال کا باعث بھی بن سکتا ہے۔

اسرائیل کے ساتھ شدید تلخی

اسرائیل تنازع جوہری پروگرام کی وجہ سے ایران کو اپنے لیے سب سے بڑا خطرہ تصور کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ایران کی جانب سے اسرائیل کے مخالف گروپس کو اسلحے کی فراہمی بھی کشیدہ تعلقات کے بنیادی اسباب میں شامل ہے۔

ایران خود کو اسرائیلی حکومت کے خلاف فلسطینیوں کی مزاحمت کے سب سے بڑے سرپرست کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اعلیٰ ترین ایرانی حکام کئی دہائیوں سے اسرائیل کو صفحۂ ہستی سے مٹانے جیسی دھمکیاں دیتے آئے ہیں۔ ابراہیم رئیسی ایک قدامت پسند رہنما تھے اور انہیں ایران کے رہبرِ اعلیٰ خامنہ ای کا ممکنہ جانشین سمجھا جاتا تھا۔ انہوں نے گزشتہ ماہ اپنے ایک بیان میں اسرائیل پر شدید تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ پہلے ہمیں قابض قوت کو نکالنا ہوگا۔ پھر اس سے نقصانات کی بھرپائی کرانا ہوگی اور آخر میں اسے انصاف کے کٹہرے میں لانا ہوگا۔

سمجھا جاتا ہے کہ اسرائیل نے گزرے برسوں میں متعدد بار ایران کے سینئر عسکری حکام اور جوہری سائنس دانوں کو خفیہ کارروائیوں میں نشانہ بنایا ہے۔ ایرانی صدر کے ہیلی کاپٹر حادثے میں اسرائیل کے کسی کردار سے متعلق کوئی ثبوت موجود نہیں ہے اور نہ ہی اسرائیلی حکام نے باضابطہ طور پر اس واقعے پر کوئی تبصرہ کیا ہے۔ تاہم خبر رساں ادارے 'رائٹرز' کے مطابق ایک اسرائیلی عہدے دار نے شناخت ظاہر نہ کرنے کی شرط پر کہا ہے کہ اسرائیل کا ایرانی صدر کے ہیلی کاپٹر کو پیش آنے والے حادثے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

خلیجی ممالک بھی ایران سے متعلق تحفظات رکھتے ہیں اور اس پر اعتماد نہیں کرتے۔ متحدہ عرب امارات اور بحرین کی جانب سے ۲۰۲۰ء میں اسرائیل کے ساتھ باضابطہ تعلقات قائم کرنے میں ایران سے متعلق ان کے خدشات کو کلیدی محرک قرار دیا جاتا ہے۔

لبنان سے یمن تک پھیلی پراکسی وار

فلسطینی تنظیم حماس نے رئیسی کے ہیلی کاپٹر کو حادثہ پیش آنے سے متعلق خبروں پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے ایران کے ساتھ یکجہتی کا اظہار کیا تھا۔ گزشتہ برس اسرائیل پر حملہ کرنے والی تنظیم حماس کو گزشتہ کئی برسوں سے ایران کی مالی امداد اور دیگر شعبوں میں معاونت حاصل رہی ہے۔

ایک اور فلسطینی عسکریت پسند گروپ اسلامی جہاد کے بھی ایران سے روابط ہیں۔ یہ گروپ اکتوبر کے حملوں کے بعد شروع ہونے والی غزہ جنگ میں بھی حصہ لے رہے ہیں۔ تاہم سات اکتوبر کے حملوں میں حماس کو ایران کی مدد حاصل ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

ایران کے سپریم لیڈر کی عرب اسرائیل تعلقات معمول پر لانے کی کوششوں پر تنقید

غزہ جنگ شروع ہونے کے بعد سے ایرانی رہنما فلسطینیوں سے اظہارِ یکجہتی کر رہے ہیں جبکہ خطے میں اس کے اتحادی نے بیانات سے بڑھ کر عملی طور پر بھی کردار ادا کیا ہے۔

غزہ میں جنگ کے آغاز کے بعد سے خطے میں ایران کی سب سے زیادہ طاقتور پراکسی حزب اللہ نے محدود پیمانے پر اسرائیل کے ساتھ جھڑپیں کی ہیں اور روزانہ کی بنیاد پر دوطرفہ گولہ باری جاری رہی ہے۔ اس کشیدگی کی وجہ سے اسرائیل اور لبنان کی سرحد پر ہزاروں افراد کو نقل مکانی کرنا پڑی ہے۔ تاہم اس کشیدگی نے باقاعدہ جنگ کی شکل اختیار نہیں کی ہے۔

عراق اور شام میں ایران نواز عسکریت پسند امریکی اڈوں پر حملے کر چکے ہیں۔ تاہم جنوری میں ایک ڈرون حملے سے تین امریکی فوجیوں کی ہلاکت کے بعد امریکا کی جانب سے جوابی کارروائیوں کے بعد یہ سلسلہ رک گیا ہے۔

خطے میں یمن کے حوثی بھی ایران کے اہم اتحادی ہیں۔ حوثی باغی بحیرۂ احمر میں بین الاقوامی جہاز رانی کو نشانہ بناتے آ رہے ہیں۔ ان حملوں میں جن جہازوں کو نشانہ بنایا گیا ہے ان کا براہِ راست اسرائیل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان حملوں کے جواب میں امریکا کی سربراہی میں آپریشنز کیے گئے ہیں۔

مشرقِ وسطیٰ سے باہر

ایران کا اثر و رسوخ مشرقِ وسطیٰ سے باہر اور اسرائیل کے ساتھ مخاصمت سے ماورا ہے۔ اسرائیل اور مغربی ممالک طویل عرصے سے یہ شبہ ظاہر کرتے آئے ہیں کہ ایران پُرامن مقاصد کی آڑ میں جوہری ہتھیار بنانے کی کوششوں میں مصروف ہے۔ وہ ایران کی کوششوں کو جوہری ہتھیاروں کے عدم پھیلاؤ کے خلاف شدید خطرہ تصور کرتے ہیں۔

امریکا کے سابق صدر ڈونلڈ ٹرمپ ایران کے ساتھ جوہری معاہدے سے دست بردار ہو گئے تھے جو ۲۰۱۸ء میں ان کے پیش رو صدر اوباما کے دور میں کیا گیا تھا۔ صدر ٹرمپ نے اس کے بعد ایران پر سخت پابندیاں عائد کر دی تھیں۔ عام طور پر اسرائیل کو مشرقِ وسطیٰ کی واحد جوہری قوت تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن اسرائیل نے کبھی اپنی جوہری صلاحیت کا اعلان نہیں کیا۔

باقی صفحہ نمبر ۵

ٹرمپ کو مجرم قرار دینے کا فیصلہ انتخابات پر اثرانداز ہوگا؟

اینڈریو فائن برگ

چاہے یہ خوش قسمتی ہے یا کوئی اور وجہ کہ ڈونلڈ ٹرمپ نے پوری زندگی اپنے اعمال کے نتائج سے بچتے ہوئے گزاری ہے۔ وہ بلا روک ٹوک زندگی گزارتے رہے ہیں اور جب ان کے اپنے عمل کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا تو انہوں نے الٹا دوسروں کو ہی مجرم قرار دے ڈالا۔ یہ 'میں ربڑ ہوں، تم گوند ہو' کی حکمت عملی کا ایک حصہ تھا، جس کی وجہ سے انہوں نے ۲۰۱۶ء کے صدارتی انتخابات میں سابق نیویارک سینیٹر اور اوباما انتظامیہ کی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن کو شکست دی۔

ان لوگوں کے لیے جنہیں شاید یاد نہ ہو، کلنٹن نے ۱۶-۲۰۱۵ء کے انتخابی دور میں زیادہ تر وقت ایک اسکینڈل کے سائے میں گزارا تھا، جس کا تعلق ان کے امریکی وزیرِ خارجہ کے طور پر کام کرتے ہوئے ایک نجی ای میل سرور کے استعمال سے تھا۔ کانگریس کے تحت کی جانے والی تفتیش سے پتا چلا کہ ان کے معاونین سے موصول ہونے والی کچھ ای میل میں ایسی معلومات تھیں جو بعد میں خفیہ قرار دی گئیں۔

تھیوری کی حد تک یہ معلومات، ان پر قومی دفاعی معلومات کی دیکھ بھال سے متعلق امریکی قوانین کی خلاف ورزی کے الزام میں فردِ جرم عائد کرنے کے لیے کافی ہوسکتی تھیں۔ اس انتخابی مہم کے دوران ٹرمپ نے بار بار انہیں مجرم قرار دیا۔ اکتوبر ۲۰۱۶ء کے ایک مباحثے میں انہوں نے کہا کہ اگر وہ صدر بن گئے تو کلنٹن جیل میں ہوں گی۔

اب آٹھ سال بعد ٹرمپ کی خوش قسمتی کے دن ختم ہوگئے ہیں۔ انہیں ایک عدالت میں مجرم قرار دیا گیا ہے۔ نیویارک کے ۱۲ رجیوری ارکان نے انہیں ۳۴ سنگین جرائم میں کاروباری ریکارڈ میں ردوبدل کرنے کا مجرم پایا، جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ ۲۰۱۶ء کے صدارتی انتخابات کو غیر قانونی طور پر متاثر کرسکیں۔

ٹرمپ پر الزام تھا کہ انہوں نے اپنے اس وقت کے وکیل مائیکل کوہن کے ذریعے اسٹورمی ڈینیلز کو ایک لاکھ ۳۰ ہزار ڈالر کی 'خاموشی کی قیمت' کہلانے والی رقم ادا کی۔ اسٹورمی ڈینیلز نے کہا تھا کہ ٹرمپ نے ان کے ساتھ جنسی تعلق قائم کیا ہے اور یہ خبر ہیلری کلنٹن کے خلاف ان کی انتخابی مہم کو نقصان پہنچا سکتی تھی۔

اگرچہ ٹرمپ اب دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کی سزا 'جعلی' ہے اور انہوں نے اس کے خلاف اپیل کرنے کا عہد کیا ہے، لیکن اب وہ پہلی بار حقیقی نتائج کا سامنا کرنے والے ہیں۔

انہیں فلوریڈا میں ووٹ دینے سے روکا جاسکتا ہے لیکن صرف اس صورت میں کہ اگر وہ جیل میں ہوں۔ انہیں کچھ پیشہ ورانہ لائسنس حاصل کرنے اور بہت سی ریاستوں میں کچھ قسم کے کاروبار چلانے سے روکا جاسکتا ہے اور کچھ ممالک انہیں داخلے سے روک سکتے ہیں یا انہیں ویزا حاصل کرنے کے لیے اضافی شرائط پوری کرنے کی ضرورت ہوسکتی ہے۔

لیکن ٹرمپ کے لیے سب سے سنگین نتیجہ جو ان کے مستقبل پر سب سے زیادہ وسیع اثرات ڈال سکتا ہے، وہ ووٹروں کی جانب سے آسکتا ہے۔ این پی آر اور پی بی ایس کی جانب سے کروائے گئے ایک نئے سروے کے مطابق، جو ماریسٹ کالج نے انجام دیا، ۱۷ رفیصد جواب دہندگان نے کہا کہ ٹرمپ کے خلاف مجرم قرار دیے جانے کا فیصلہ، نومبر میں ٹرمپ کو ووٹ دینے کے ان کے امکانات کو کم کردے گا۔

بظاہر ۱۷ رفیصد کچھ زیادہ نہیں۔ یہ صرف چھ میں سے ایک ووٹر کی نمائندگی کرتا ہے، جبکہ اکثر جواب دہندگان نے کہا کہ ٹرمپ کے خلاف مجرم قرار دیے جانے کا فیصلہ ان کے ووٹ دینے کے طریقے پر کوئی فرق نہیں ڈالے گا۔

لیکن امریکی صدارتی انتخابات میں یہ چھوٹے فرق ہی سب سے زیادہ اہم ہوسکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکی شہری صدر کو قومی عوامی ووٹ کے ذریعے نہیں بلکہ ۵۰ رانفرادی انتخابات کے ذریعے منتخب کرتے ہیں، جن کے نتائج ہر ریاست کی آبادی کے مطابق تیار کیے جاتے ہیں۔

اسی پیچیدہ نظام کی وجہ سے ٹرمپ نے ۲۰۱۶ء میں تین اہم ریاستوں (وسکونسن، مشی گن، اور پنسلوانیا) کو جیت کر ہیلری کلنٹن کو شکست دی، حالانکہ انہوں نے مجموعی قومی انتخابات میں کئی ملین ووٹوں کے فرق سے شکست کھائی تھی۔

آخر میں جب ٹرمپ چار سال بعد بائیڈن کے مقابلے میں آمنے سامنے آئے تو ان تین ریاستوں میں تقریباً ۳۰ ہزار ووٹوں ہی نے فرق ڈالا۔ اس وقت جارجیا، ایریزونا اور وسکونسن میں صرف ۴۴ ہزار ووٹوں کا فرق تھا جو بائیڈن کو جتوانے میں مددگار رہا۔

اگرچہ بائیڈن رائے عامہ کے بہت سے جائزوں میں پیچھے نظر آرہے ہیں، لیکن اگر ٹرمپ کے حامی چھ میں سے ایک ووٹر بھی اس نومبر میں ووٹ دینے سے باز رہے یا انہوں نے موجودہ صدر کے لیے ووٹ دیا، تو اس سے ٹرمپ کے وائٹ ہاؤس واپس آنے کے امکانات ختم ہوسکتے ہیں۔

اور اگر وہ اس نومبر میں دوسری غیر مسلسل مدت کے لیے جیتنے میں ناکام رہے، تو ان کے خلاف باقی تین مجرمانہ مقدمات کے مشترکہ وزن کا مطلب ہوسکتا ہے کہ ٹرمپ اپنی بقیہ زندگی جیل میں گزار دیں۔

(بحوالہ: ''انڈی پنڈنٹ اردو ڈاٹ کام''۔ ۳۱ مئی ۲۰۲۴ء)

بقیہ: نریندر مودی کے ۸۰ رانٹرویو

بعض تجزیہ کاروں کے مطابق راہل گاندھی سوشل میڈیا اور یوٹیوبرز پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں۔ انہوں نے انتخابات سے کچھ پہلے نئی دہلی میں یوٹیوبرز کے ایک گروپ سے ملاقات کی تھی اور ان سے دوبارہ ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن پھر ایسی کوئی ملاقات نہیں ہوسکی۔

بعض مبصرین کے مطابق یہ انتخاب ڈیجیٹل انتخاب زیادہ ہیں۔ اسی لیے راہل گاندھی سوشل میڈیا پر زیادہ سرگرم ہیں۔

پلوی گھوش اور سید رومان ہاشمی دونوں کی رائے ہے کہ سوشل میڈیا سے عوام کو زیادہ متاثر کیا جاسکتا ہے بہ نسبت الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے۔ نیوز چینلوں کی رپورٹس بھی سوشل میڈیا پر پوسٹ کی جاتی ہیں۔ ان کو ناخواندہ شخص بھی دیکھ اور سن سکتا ہے۔

جہاں تک انتخابی مہم میں سرگرمی کی بات ہے تو وزیرِ اعظم مودی راہل گاندھی کے مقابلے میں کہیں زیادہ آگے ہیں۔

میڈیا رپورٹس کے مطابق ۳۰ مئی تک وزیرِ اعظم مودی کے روڈ شوز، ریلیوں اور عوامی تقریروں کی تعداد ۱۸۰ تک پہنچ گئی جبکہ راہل گاندھی نے اب تک صرف ۶۰ عوامی ریلیاں کی ہیں۔ مودی یومیہ دو تین ریلیوں سے خطاب کرتے ہیں۔ انہوں نے بعض مخصوص مواقع پر ایک دن میں پانچ پانچ ریلیاں کی ہیں جبکہ راہل گاندھی ایک دن میں صرف ایک یا دو ریلی کرتے ہیں۔

کانگریس کے مطابق اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو کانگریس کے پاس وسائل کی کمی ہے اور دوسرے اس نے ڈیجیٹل میڈیا پر زیادہ انحصار کیا ہے۔

(بحوالہ: ''وائس آف امریکا اردو ڈاٹ کام''۔ ۲۲ مئی ۲۰۲۴ء)

ناروے "آزاد فلسطین تحریک" کا مرکز کیسے بنا؟

عفت حسن رضوی

اسٹورتھنگ ناروے کی پارلیمنٹ کو کہا جاتا ہے جس کے لغوی معنی ہیں بڑی چیز۔ ناروے جہاں آئین وقانون کا بول بالا ہے وہاں پارلیمنٹ واقعی بڑی چیز ہے۔ اسی پارلیمنٹ کی عمارت کے اندر جمہوری نمائندے فیصلے کرواتے ہیں لیکن عمارت کے باہر فیصلہ جمہور سناتی ہے۔

اوسلو میں نارویجن پارلیمنٹ کی عمارت کا احاطہ بالکل ویسے ہی استعمال ہوتا ہے جیسے پاکستان میں ہونے والے احتجاج کے لیے اسلام آباد کا ڈی چوک۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں پریس کلبوں کے باہر احتجاج نہیں ہوا کرتے کیوں کہ میڈیا بغیر کسی ایجنڈے کے ہر جمہوری تحریک کو کوریج دیتا ہے، سو نارویجن میڈیا کو جگانے کے لیے اس کا دروازہ نہیں پیٹنا پڑتا۔ دوسرا یہ کہ یہاں احتجاج یا ریلی نکالنا ہر انسان کا بنیادی حق مانا جاتا ہے، سو اپنا حق جتانے کے لیے پارلیمنٹ سے بہتر کون سا مقام ہوسکتا ہے۔

گزشتہ برس سات اکتوبر کے واقعات کے بعد فلسطین پر اسرائیلی جارحیت نے ایک نئی اور شدید صورت اختیار کرلی۔ فلسطین پر اسرائیلی بربریت کے واقعات نئے نہیں لیکن جو مناظر اس بار سوشل میڈیا کے ذریعے ہر ہتھیلی پر سجے موبائل فون دکھا رہے ہیں، ان کی نوعیت بہت مختلف ہے۔

دنیا بھر کی طرح نارویجن عوام بھی یہ مناظر دیکھ رہے ہیں، لیکن نارویجن عوام کا فلسطینیوں کی حمایت میں ردعمل دیگر یورپی ممالک کے مقابلے میں بہت واضح اور کھرا ہے۔

ناروے میں مقبول نعرہ 'بائیکاٹ اسرائیل' ہے۔ بائیکاٹ اسرائیل کا نعرہ شاید مسلمان پناہ گزین کسی نہ کسی جھجک کے ساتھ لگاتے ہوں لیکن مقامی نارویجن بڑے دھڑلے سے نارویجن زبان کی گالم گلوچ کے ساتھ عوامی مقامات پر اسرائیل کی کلاس لیتے ہیں۔

فلسطین کی حمایت میں بعض نارویجن اتنے جذباتی ہیں کہ مظاہروں میں ایسے کئی افراد نظر آتے ہیں جو زار وقطار رو رہے ہوتے ہیں، جو سسکیاں لے رہے ہوتے ہیں یا سرخ آنکھوں کے ساتھ دنیا سے مطالبے کر رہے ہوتے ہیں کہ کم از کم فلسطین کے بچوں پر تو رحم کھاؤ۔

اپنے یہاں کسی دوسرے ملک کا جھنڈا لہرانے پر غداری کے مقدمات بننے کا ڈر لگا رہتا ہے لیکن ناروے میں مظاہرین فلسطین کا جھنڈا پارلیمنٹ کی عمارت کے احاطے میں سجے مجسموں پر کھلم کھلا لہراتے ہیں، کسی کو منہ ٹیڑھا کرتے نہیں دیکھا۔ بعض گھروں اور بالکونیوں پر فلسطینی پرچم لہرا رہے ہیں، کہیں حب الوطنی پر سوال نہیں اٹھتا۔

معروف فلسطینی کارٹون کریکٹر ہندالا کے نام سے ناروے کے سماجی کارکن ایک چھوٹا پانی کا جہاز یورپ بھر میں چلاتے ہیں، جس کا مقصد فلسطینی مہم کے لیے یورپی عوام میں آگاہی پیدا کرنا ہے۔ ناروے کی معروف امدادی تنظیموں کا فلسطین میں کام اتنا زیادہ ہے کہ الگ کالم لکھنا ہوگا۔

اب ناروے کی ٹرین، بسوں اور عوامی مقامات پر فلسطینی اسکارف کوفیہ میں ملبوس نارویجن بہت معمول سے نظر آتے ہیں۔ آزاد فلسطین مہم میں فلسطینی پھل تربوز کو بطور استعارہ استعمال کیا جاتا ہے۔ یہاں تربوز کی شکل سے سجی جیولری، اسکارف، موبائل کور وغیرہ بہت مقبول ہوگئے ہیں۔ بعض نوجوان نارویجن لڑکیاں آزاد فلسطین کے اسٹیکر ناروے کے گروسری اسٹور پر رکھی مصنوعات پر چپکا دیتی ہیں۔

ایسے ہی اوسلو میں حال ہی میں فلسطینی برانڈ کی اشیا کی خریداری کا رجحان پیدا ہوا ہے۔ سوشل میڈیا پر نارویجن پوچھتے نظر آتے ہیں کہ فلسطینی لباس، زیتون یا فلسطینی جھنڈے کہاں سے مل سکتے ہیں۔

ناروے کی یونیورسٹیوں کے احاطے میں فلسطین کے حمایتی طالب علموں نے خیمے گاڑ رکھے ہیں، جہاں غزہ کے لیے فنڈ زجمع کیے جاتے ہیں، یہ طالب علم یونیورسٹی انتظامیہ سے فلسطین کی حمایت میں واضح موقف اپنانے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

فلسطین کی آزادی کے لیے ناروے کے لوگ اپنی پبلک اور پرائیوٹ زندگیوں میں کھل کر رائے کا اظہار کر رہے ہیں۔ اگرچہ ایسے نارویجنز کی تعداد بھی کم نہیں جو فلسطینی معاملے پر اسرائیل کی حمایت یا غیر جانبدار رہنے کو ترجیح دیتے ہوں گے لیکن بہرحال سڑکوں پر نکلے ہزاروں نارویجنز بار بار یہ باور کرواتے ہیں کہ وہ آزاد فلسطین کے معاملے پہ چپ نہیں رہیں گے۔

عوامی احتجاج کا سنتے ہیں تو لامحالہ خیال یہی آتا ہے کہ عوام کا کیا ہے، دو چار نعرے لگا کر ایک طرف ہو جاتے ہیں۔ ان کی سنتا کون ہے؟ لیکن فلسطین کے معاملے پر ناروے کے عوام کا ردعمل اور حکومتی پالیسی بظاہر ایک سی نظر آتی ہے۔

ناروے تسلسل کے ساتھ اسرائیلی جارحیت پر بیان دے رہا تھا لیکن ۲۸ مئی کو ناروے نے باقاعدہ فلسطین کو ایک آزاد ریاست تسلیم کر کے اہم قدم اٹھایا ہے۔ اس فیصلے پر ناروے میں فلسطین کاز کے حمایتیوں نے خوشی کا اظہار کیا ہے۔

ناروے اس سے قبل ۹۰ کی دہائی میں اسرائیل فلسطین کے مابین امن کے لیے اوسلو معاہدے پر کام کر چکا ہے۔ ناروے میں سفارت کاری کے اسکالر اور بین الاقوامی تعلقات کے ماہرین اوسلو معاہدے کو ناروے کی خارجہ پالیسی کا اہم باب گردانتے ہیں۔ اس احساس کے ساتھ کہ اوسلو معاہدہ اب سوائے کاغذ کے ایک ٹکڑے کے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ ناروے کا فلسطین کو آزاد ریاست تسلیم کرنا اسی امن معاہدے میں پھر سے جان ڈالنے کی ایک کوشش ہے، جس میں اسرائیل اور فلسطین دو آزاد ریاستوں کو امن کے ساتھ رہنے کا حل تجویز کیا گیا تھا۔

ناروے فلسطین کو تسلیم کر چکا لیکن فلسطین کی آزادی کی مہم چلانے والے نارویجنز اپنی حکومت سے اب اسرائیل کے باقاعدہ ریاستی وسفارتی بائیکاٹ کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

وقت دیکھ رہا ہے کہ کون کتنے پانی میں ہے، یہ بھی وقت ہی بتائے گا کہ نارویجن عوام کا یہ پرزور اور انتہائی شدید مطالبہ کیا صرف سڑکوں پر گونجتا رہے گا یا ناروے کی خارجہ پالیسی بھی بنے گا۔

(بحوالہ: ''انڈی پنڈنٹ اردو ڈاٹ کام''۔ ۳۱ مئی ۲۰۲۴ء)

○○○

بقیہ: فضائی حادثے میں ایرانی صدر کی رحلت

یوکرین پر روس کے حملے کے بعد ایران اس کے قریبی اتحادی کے طور پر سامنے آیا ہے۔ ایران پر الزام عائد کیا جاتا ہے کہ وہ روس کو یوکرین کے شہروں پر حملوں میں استعمال ہونے والے ڈرونز فراہم کرتا ہے۔ صدر ابراہیم رئیسی نے 'ایسوسی ایٹڈ پریس' کو ایک انٹرویو میں ان الزامات کی تردید کی تھی۔ ایرانی حکام اس بارے میں متضاد بیانات دیتے رہے ہیں جبکہ امریکا اور یورپی حکام کا کہنا ہے کہ یوکرین جنگ میں ایرانی ڈورنز بڑی تعداد میں استعمال ہو رہے ہیں۔

(بحوالہ: ''وائس آف امریکا اردو ڈاٹ کام''۔ ۲۰ مئی ۲۰۲۴ء)

امریکی انتخابات میں "تیسری جماعت" کی اہمیت

امریکا میں ہر چوتھے موسم گرما میں ملک کی دو بڑی سیاسی پارٹیاں صدارتی نامزدگی کے سلسلے میں اپنے کنونشن منعقد کرتی ہیں۔ اس بار جولائی میں ریپبلکنز سابق صدر ڈونلڈ ٹرمپ کو اپنی پارٹی کی جانب سے نامزدگی کی فہرست میں سب سے اوپر رکھنے کے لیے ملواکی میں کنونشن کی تیاری کر رہے ہیں جبکہ ڈیموکریٹس بھی اگلے مہینے صدر جو بائیڈن کو اگلے عہدے کی مدت کے لیے نامزد کرنے کے لیے رسمی کارروائیاں کرنے والے ہیں۔

میڈیا میں صدارتی نامزدگی سے متعلق دوسرے سیاسی اجتماع پر کم ہی توجہ دی جاتی ہے۔ بڑی شان و شوکت والے کنونشنز کے مقابلے میں آزادی پسند لبرٹیرینز کی جانب سے صدارتی نامزدگی کی تقریب کم درجے کی ہوتی ہے اور اس میں خاص جوش و خروش بھی دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن اس سال صورت حال کافی مختلف ہے اور لبرٹیرین بھی جوش و جذبے سے بھرپور نظر آرہے ہیں اور صدارتی امیدوار کی نامزدگی کے لیے زیادہ تر ریاستوں میں اپنے اجتماعات کریں گے۔

رائے عامہ کے اب تک کے جائزوں کے مطابق بائیڈن اور ٹرمپ میں سخت مقابلہ جاری ہے، جبکہ آزاد امیدوار رابرٹ ایف کینیڈی جونیئر کچھ ایسی ریاستوں میں، جن کا انتخابی جھکاؤ کسی بھی امیدوار کی جانب جا سکتا ہے، ۱۰ فی صد سے زیادہ ووٹ لے رہے ہیں۔ لبرٹیرین امیدوار کو ملنے والے ووٹوں کی کم تعداد یہ فیصلہ کر سکتی ہے کہ اگلی مدت کے لیے صدر کا انتخاب بائیڈن یا ٹرمپ میں سے کون جیتے گا۔

لبرٹیرین پارٹی کے صدارتی امیدواروں میں سے کوئی بھی معروف اور جانا پہچانا نام نہیں ہے۔ ان میں نیو آرلینز کے سرجن چارلس بیلی، تفریحی شعبے سے تعلق رکھنے والے اور ایک ٹیک کمپنی قائم کرنے والے لیرس میسٹیڈ، جارجیا سے تعلق رکھنے والے سرگرم سیاسی کارکن چیز اولیور اور ایک ماہر معاشیات مائیک ٹرماٹ ہیں۔ اب یہ تقریباً ایک ہزار مندوبین پر منحصر ہے کہ صدارتی ووٹنگ میں حصہ لینے کے لیے کس امیدوار کو آگے کرتے ہیں۔

پارٹی کا نام لبرٹیرین کیوں ہے؟

لبرٹیرینز نے یہ نام اٹھارویں صدی کی اس آزادی پسند تحریک سے لیا ہے، جس نے یورپ اور کئی دوسرے مقامات پر بادشاہت، غلامی اور مذہبی ظلم و جبر کے خلاف جنگیں لڑیں اور انفرادی آزادی کے فلسفے کو آگے بڑھایا۔

امریکا میں موجود لبرٹیرین پارٹی کو اپنے اندر بھی کئی مسائل کا سامنا ہے۔ اس پارٹی کے اندر موجود ایک بڑا گروپ جو 'میسز کاکس' کہلاتا ہے، عمومی طور پر ایک سابق مارکسٹ اسکالر مائیکل ریکٹن ورلڈ کے فلسفے کی طرف جھکاؤ رکھنے والے صدارتی امیدوار کی حمایت کرتا ہے۔ یہ معاشی نظریہ آزاد منڈی کے سرمایہ داری نظام کی حمایت کرتا ہے۔

ٹرمپ کا جھکاؤ لبرٹیرین کی طرف کیوں ہے؟

ڈینور یونیورسٹی میں پولیٹیکل سائنس کے پروفیسر سیٹھ مارسکیٹ کا کہنا ہے کہ ٹرمپ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ الیکشن میں ووٹوں کا فرق بہت کم ہوگا اور ان ریاستوں کے چند فیصد ووٹ، جنہیں سوئنگ اسٹیٹس کہا جاتا ہے، نتائج پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ وائس آف امریکا سے بات کرتے ہوئے ماسکیٹ نے کہا کہ ٹرمپ کے ایجنڈے میں ایک چھوٹی اور کم جارحانہ، آزادی پسندانہ نظریات رکھنے والی پارٹی سے مطابقت دیکھنا مشکل ہے لیکن وہ لبرٹیرین پارٹی کے رہنماؤں کی جانب سے اٹھائے جانے والے کچھ اور مسائل سے ہم آہنگی پیدا کر سکتے ہیں۔

کچھ آزادی پسند، ٹرمپ کی جانب سے اپنی سیاسی حدود میں داخلے کو محض توجہ حاصل کرنے کی ایک اور چال کے طور پر دیکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اپنے بڑے اور پرجوش جلسوں سے خطاب کرنے والے سابق صدر کو آزاد سیاسی ہجوم کے کچھ رویے حیران کر سکتے ہیں۔ ورجینیا سے تعلق رکھنے والے ایک لبرٹیرین مندوب جیمز جان، جو تعمیراتی شعبے سے منسلک ہیں، کہتے ہیں کہ یہ ٹرمپ کے لیے وہ کچھ کہنے کا موقع ہے، جو وہ کہنا چاہتے ہیں۔ لیکن وہاں ممکنہ طور پر کچھ ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو انہیں نارمل انداز میں نہ سننا چاہیں۔

امریکا میں لبرٹیرینز کے سب سے معروف تھنک ٹینک کیٹو انسٹی ٹیوٹ کے صدر اور چیف ایگزیکٹو پیٹر گوئٹلر کہتے ہیں کہ اب یہ پارٹی آزادی پسند نہیں رہی۔ اس ہفتے ٹرمپ کا اس میں ظاہر ہونا لبرٹیرین پارٹی کے بارے میں اتنا کچھ کہہ رہا ہے جتنا کہ وہ اس کے بارے میں کہتے ہیں۔

پارٹی کو اپنی تاریخ کے پورے سفر میں اتار چڑھاؤ اور کچھ پریشان کن لمحات کا بھی سامنا رہا ہے۔ لیکن اس کے مسائل کا زیادہ تر تعلق غیر پیشہ ورانہ رویے اور نظم و ضبط کے فقدان سے ہے جس کے اس پر دو پارٹی نظام میں ایک تیسری چھوٹی پارٹی کی حیثیت سے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔

ٹرمپ الیکشن میں بائیڈن کو کوئی موقع دینا نہیں چاہتے

گزشتہ ہفتے نیشنل رائفل ایسوسی ایشن سے خطاب میں ٹرمپ کا لبرٹیرینز کی جانب عملی جھکاؤ نظر آیا۔ انہوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ وہ لبرٹیرینز بھی عمومی طور پر سمجھ بوجھ رکھنے والے لوگ ہیں۔ ان کی کچھ چیزیں ہم سے قدرے مختلف ہیں۔ لیکن ہمیں ان کے ساتھ شامل ہونا پڑے گا۔ اس کے قطع نظر کہ کون الیکشن لڑ رہا ہے، وہ ہر سال ۳ فیصد ووٹ حاصل کرتے ہیں۔ اور ہمیں وہ ۳ فیصد ووٹ حاصل کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ ہم بائیڈن کو جیتنے کا موقع نہیں دے سکتے۔

۱۹۷۲ء میں لبرٹیرینز کی جانب سے پہلی صدارتی نامزدگی کے بعد ان کی بہترین کارکردگی ۲۰۱۶ء میں اس وقت سامنے آئی جب نیو میکسیکو کے سابق گورنر گیری جانسن نے مقبول ووٹوں میں ۳ء۲۸ فیصد ووٹ حاصل کیے۔

ورماؤنٹ سے لبرٹیرین ڈیلیگیٹ این لپلٹیئر کہتی ہیں کہ اس بات کا امکان نہیں ہے کہ ٹرمپ لبرٹیرینز کے ۳ فیصد ووٹوں کا ایک بڑا حصہ لینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ انہوں نے وائس آف امریکا سے بات کرتے ہوئے کہا کہ یقیناً کچھ لبرٹیرینز انہیں ووٹ دے سکتے ہیں۔ کیا میں بھی ٹرمپ کو ووٹ دینے والوں میں شامل ہوں گی؟ تو میرا جواب ہے کہ نہیں۔

لبرٹیرین کے کنونشن میں صدر بائیڈن کو بھی خطاب کرنے کی دعوت دی گئی تھی لیکن انہوں نے معذرت کر لی۔ بائیڈن کی انتخابی مہم کی جانب سے اس انکار اور تیسری پارٹی تک ٹرمپ کی رسائی سے متعلق پوچھے گئے سوال کا جواب نہیں دیا گیا۔

(بحوالہ: ''وائس آف امریکا اردو ڈاٹ کام''۔ ۲۸ مئی ۲۰۲۴ء)

بقیہ: امریکیوں کا ''جمہوری مزاج''

عدالتی فیصلے پر جیوری کے ارکان، ججز یا فریق مخالف کے خلاف تشدد پر کسی کو حیرت نہیں ہونی چاہیے۔ خیر، یہ سب کچھ محض غلط نہیں بلکہ انتہائی خطرناک ہے۔ کسی بھی عدالتی فیصلے پر یوں بے قابو ہو جانا اور ریاست ہی کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی باتیں کرنا شعور اور اخلاق کی سطح پر صرف زوال کی علامت ہے۔ اس حوالے سے شعور کی سطح بلند کرنے کی ضرورت ہے۔ سوشل میڈیا کے ذریعے انتشار کی چنگاریوں کو ہوا دینے والوں کے خلاف کارروائی کی جانی چاہیے''۔

(ترجمہ و تلخیص: محمد ابراہیم خان)

واٹر گیٹ اسکینڈل: گتھی کبھی سلجھے گی؟

James Rosen

پانچ دہائیاں گزر چکی ہیں مگر واٹر گیٹ اسکینڈل کی ریکارڈنگز آج بھی کسی معمے سے کم نہیں۔

امریکا کے صدر رچرڈ نکسن نے ۲۹؍اپریل ۱۹۷۴ء کو ٹیلی وژن پر پرائم ٹائم میں قوم سے خطاب کیا جو واٹر گیٹ اسکینڈل کے حوالے سے فیصلہ کن لمحہ تھا اور تہذیبی اعتبار سے بھی ایک اہم موڑ تھا گو کہ اُس وقت کوئی بھی اِس کا مکمل ادراک نہ کر پایا۔

صدر نکسن نے کہا ''ہم ایک ایسے عہد میں جی رہے ہیں جس میں مواقع بھی بہت ہیں اور چیلنج بھی کم نہیں۔'' یہ سرد جنگ کا زمانہ تھا۔ ایٹمی ہتھیاروں سے لیس دو سپر طاقتیں (امریکا اور سوویت یونین) اہم ترین عالمی امور پر مکمل بالادستی یقینی بنانے کے لیے کوشاں تھیں۔

تب واٹر گیٹ اسکینڈل کے ہاتھوں پے در پے ہونے والے انکشافات نے دو سال سے پوری قوم کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ اور اب جبکہ صدر نکسن لب کُشا ہو ہی چکے تھے تو ہر شخص یہ جاننے کے لیے بے تاب تھا کہ جتنی بھی گفتگو ریکارڈ کی گئی ہے اُس میں آخر ہے کیا۔ صدر نکسن کے بائیں طرف کیمرا دو سیاہ بنڈل دکھا رہا تھا جن پر سنہرے حروف میں ریاستی مندرجات تھے اور صدارتی مہر بھی ثبت تھی۔

صدر نکسن نے بتایا ''اِن فولڈرز میں، جو آپ دیکھ رہے ہیں، ۱۵؍ستمبر ۱۹۷۲ء سے ۲۷؍اپریل ۱۹۷۳ء تک کی، واٹر گیٹ اسکینڈل سے متعلق، اُس نجی گفتگو کی ٹرانسکرپشن ہے میں نے جس میں اپنے کلیدی معاونین اور ایوانِ صدر سے وابستہ افراد کے ساتھ حصہ لیا۔''

گویا واٹر گیٹ ٹیپ پہلی بار منظرِ عام پر لائے گئے۔ ان ٹیپس کا وجود جولائی ۱۹۷۳ء میں پہلی بار، تذکرے کے طور پر، منظرِ عام پر آیا تھا جب صدر نکسن کے معاون الیگزینڈر بٹر فیلڈ نے سینیٹ کی واٹر گیٹ کمیٹی کے روبرو، ٹی وی پر دکھائی جانے والی ساعتوں میں، انکشاف کیا تھا کہ صدر نکسن نے ۱۹۷۱ء کے اوائل سے اپنے آپ کو خفیہ طور پر ریکارڈ کرنا شروع کر دیا تھا۔

گفتگو ریکارڈ کرنے کے نظام کا نظم و نسق اس قدر ناقص تھا کہ بم کی طرح پھٹنے والے بٹر فیلڈ کے انکشافات کے بھی دو دن بعد سونی کا سسٹم 800B-TC روکا اور ٹھکانے لگایا جا سکا۔

صدر نکسن نے جو کچھ کیا وہ کوئی پہلی بار کا معاملہ نہیں تھا۔ فرینکلن روزویلٹ اور اُن کے بعد آنے والے ہر امریکی صدر نے چند گفتگوئیں ریکارڈ کی تھیں۔

ٹیکنالوجی کا معیار بلند ہونے سے یہ مشق، بے سمت سفر کی طرح، پروان چڑھتی گئی۔ جان ایف کینیڈی نے ۲۶۰ گھنٹے کے ٹیپ تیار کیے اور لِنڈن بی جانسن نے ۸۰۰ گھنٹے کے۔ خفیہ سروس کے ذریعے چلایا جانے والا رچرڈ نکسن کا نظام البتہ غیر معمولی خواہشات و مقاصد کا حامل تھا۔

فروری سے مئی ۱۹۷۱ء کے دوران ایوانِ صدر کے اوول آفس میں صدر کی ڈیسک، اوول آفس کے آتش دان میں وال لیمپس کے اوپر، اوول آفس کے ٹیلی فون، کیبنیٹ روم، لِنکن سِٹنگ روم کے ٹیلی فون، اولڈ ایگزیکٹیو آفس بلڈنگ میں رچرڈ نکسن کے ہائڈوے آفس اور ایسپن لاج (کیمپ ڈیوڈ) کے ٹیلی فونز میں دو درجن مائیکروفون نصب کیے گئے۔

کیبنیٹ روم کے سوا تمام مائیکروفون وائس ایکٹیویٹیڈ تھے یعنی ریکارڈنگ اُس وقت شروع ہوتی تھی جب کوئی بولنا شروع کرتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ خود صدر نکسن بھی ریکارڈنگ کے عمل کو عارضی یا مکمل طور پر روک نہیں سکتے تھے۔ یہ گویا میکینکل ڈیوائسز سے متعلق صدر کے اُس اناڑی پن سے بچنے کی خاطر کیا گیا جس سے ان کے ماتحت افراد اچھی طرح واقف تھے۔

یوں نکسن انتظامیہ انسانی تاریخ میں سب سے زیادہ ڈاکیومینٹیڈ حکومت کے طور پر ابھری۔ دنیا کے سب سے طاقتور لیڈر کی ۳۷۰۰ گھنٹوں کی ریکارڈنگ کی گئی جو منصبی فرائض کی انجام دہی کے دوران ریئل ٹائم میں تھی۔ یہ ریکارڈنگ میگنیٹک ٹیپ کی ۹۵۰ ریلز پر محفوظ کی گئی جس پر لیبل ناقص طور پر اور لاپروائی سے لگائے گئے اور ان تمام ریلز کو ایگزیکٹیو آفس بلڈنگ میں سیڑھیوں کے نیچے اس طور رکھا گیا کہ یہ پوری طرح بند بھی نہ تھیں اور مارکنگ بھی نامکمل تھی۔ جونیئر اسٹاف میں سے جسے ان میگنیٹک ٹیپس یا ریلز کی نگرانی سونپی گئی وہ اِسے سرد جنگ کی مناسبت سے Safe Zone-128 کہا کرتا تھا۔

مصنف جم ہاؤگن نے ۱۹۸۴ء میں شائع ہونے والی کتاب ''سیکریٹ ایجنڈا'' میں سینٹرل انٹیلی جنس ایجنسی (سی آئی اے) اور نکسن دور کے وائٹ ہاؤس کی خفیہ ایجنسی کے سابق افسر ولیم مکمیہون کے بیان کا بھی حوالہ دیا جو پہلے رپورٹ کیے جانے سے رہ گیا تھا۔

مکمیہون نے بتایا تھا کہ سی آئی اے کی طرف سے ایجنسی کے آفس آف سیکورٹی کے اُن ملازمین کے بارے میں سیکریٹ سروس ڈویژن کو باقاعدگی سے بتایا جاتا تھا جو گفتگو ریکارڈ کرنے کے نظام سے وابستہ تھے۔ جم ہاؤگن کے مطابق اِس انکشاف سے اندازہ ہوتا ہے کہ سی آئی اے کو صدر کی نجی گفتگو اور خیالات تک ایسی رسائی حاصل تھی جس میں اُس کا حریف کوئی نہ تھا۔

صدر نکسن نے ۲۹؍اپریل کی تقریر میں بتایا کہ ٹرانسکرپشن کے فولڈرز ایوانِ نمائندگان کی جیوڈیشری کمیٹی کو بھیجے جا رہے ہیں جو مواخذے کا جائزہ لے رہی ہے اور واٹر گیٹ سے متعلق ۴۲ گفتگوؤں کا ریکارڈ طلب کیا گیا ہے۔ اِن تمام چیزوں کے ساتھ ساتھ صدر کے دفاع کے لیے تیار کی گئی قانونی بریفنگ بھی فراہم کی گئی۔

صدر نکسن کی مشکلات بڑھانے میں ایک بڑا کردار نومبر ۱۹۷۳ء میں اس انکشاف کا تھا کہ ٹیپس میں خلا پایا گیا، ۵ سے ۹ مقامات پر آواز مٹا دی گئی جس کے نتیجے میں واٹر گیٹ سے متعلق گرفتاریوں کے تین دن بعد ۲۰ جون ۱۹۷۲ء کی ساڑھے اٹھارہ منٹ کی اوول آفس کی گفتگو میں شور سا بھر دیا گیا۔ اس گفتگو کے جس حصے کو بگاڑا یا مٹا دیا گیا اس میں واٹر گیٹ سے متعلق گرفتاریوں سے تعلقاتِ عامہ پر مرتب ہونے والے ممکنہ اثرات پر بات کی گئی تھی تاہم گفتگو کے دوران خلا نے صدر کی پوزیشن مزید کمزور کر دی۔

۲۹؍اپریل کی تقریر کے چند گھنٹوں کے بعد جیوڈیشری کمیٹی نے اس اعلان کے حق میں ووٹ دے دیا کہ صدر وہ سب کچھ نہیں دے سکے جو طلب کیا گیا تھا۔

قانونی چارہ جوئی شروع ہوئی۔ جولائی میں امریکی سپریم کورٹ کے ۸ رکنی بینچ نے مکمل اتفاقِ رائے سے کہا کہ کرمنل انویسٹی گیشن کا مطالبہ صدر کو حاصل خصوصی اختیارات اور استثنیٰ سے زیادہ وزنی ہے۔ اب لازم قرار پایا کہ گفتگو کی محض کاپیاں (ٹرانسکرپٹ) فراہم نہ کی جائیں بلکہ اصل ٹیپ پیش کیے جائیں۔

جب یہ مواد ۵؍اگست کو پیش کیا گیا تب اس میں

''اسموکنگ گن'' بھی شامل تھی۔ اوول آفس ٹیپ نے ۲۳ جون ۱۹۷۲ء کو صدر نکسن کا ایسا منصوبہ بھی ریکارڈ کیا جس کے مطابق سی آئی اے کے ڈائریکٹر سے کہا گیا تھا کہ تحقیقات روکنے کے لیے ایف بی آئی پر دباؤ ڈالے۔

اِس پر ہنگامہ برپا ہوا۔ عوام کی طرف سے دباؤ اس قدر بڑھا کہ صدر نکسن ۸/اگست کو مستعفی ہوگئے۔ ٹی وی پر لائیو بولتے ہوئے رچرڈ نکسن نے فولڈرز کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ یہ سب کچھ جیوڈیشری کمیٹی کو تو بھیجا ہی جائے گا، عوام بھی پڑھ سکیں گے۔ دنیا کی تاریخ میں آج تک کسی بھی لیڈر نے اپنی روزمرہ کارکردگی اور فیصلہ سازی سے متعلق اِس قدر نجی اور خفیہ نوعیت کا ریکارڈ اُن کے سامنے پیش کرنے کی اجازت نہیں دی جن کا وہ حکمران رہا ہو۔

رچرڈ نکسن نے، اپنی تقریر میں، معاملات کو درست کرنے کی غرض سے کہا کہ وہ اس پورے معاملے کو حقیقی منطقی انجام تک لے جانے دیں گے اور ایسا ہی ہوا۔ ۱۰/دن بعد وہ مستعفی ہوگئے۔ طاقت کے بے جا استعمال سے متعلق انکشافات کے علاوہ اہلِ وطن معاملات پر لرزہ طاری کرنے والے صدر کی بے حرمتی پر بھی حیران رہ گئے جس کے لیے خصوصی الفاظ "Expletive Deleted" استعمال کیے گئے۔ 'Smoking Gun' کے ساتھ ساتھ یہ الفاظ بھی وائٹ ہاؤس کے جواں سال قانون دان جیوف شیپرڈ کے وضع کردہ تھے جو گفتگو کے ٹرانسکرپشنز کی مسل بندی کا نگران تھا۔ شکاگو ٹریبون نے اداریے میں لکھا ''ہم نے ایک پرائیویٹ آدمی کو دیکھا ہے اور ہم حیران رہ گئے ہیں''۔

تین بار صدارتی انتخابی مہم کے دوران رچرڈ نکسن کی حمایت کرنے والے دی اوماہا ورلڈ ہیرالڈ نے بھی اُن کے استعفے کا مطالبہ کیا۔

سی بی ایس نیوز کے ڈین ریتھر نے کہا ''ہمارے لیڈر کو (استعفے کے ذریعے) ایک اچھی مثال قائم کرنی چاہیے''۔

ریورینڈ بلی گراہم نے کہا ''میں پانچ صدور کو جانتا ہوں اور مجھے یہ کہنا ہی پڑے گا کہ اگر اُن کے ٹرانسکرپشن ہمارے پاس ہوتے تو اُن میں بھی بہت کچھ نمکین اور کٹیلا ہوتا''۔

ناول نگار نارمن میلر نے دی نیویارکر سے گفتگو میں کہا ''کوئی حقیقی آدمی ہی جانتا ہے کہ کسی منصب کا حلف کیسے اٹھایا جاتا ہے''۔ نارمن میلر کے نزدیک رچرڈ نکسن ایک بڑی کارپوریشن کے اچھے، سخت جان، ٹھنڈے مزاج والے اور خاصے بدزبان صدر تھے۔

کامیڈینز نے اس پورے معاملے کی ہجو بیان کرنے والے البم تیار کیے۔ مگر خیر، حقیقی نقصان اِس سے کہیں زیادہ حقیقی اور دیرپا تھا۔ مصنف مائیکل نوواک نے کہا کہ ان ٹیپس نے منصبِ صدارت کی علامتی طاقت کو کمزور کردیا ہے جو متمدن معاشرے میں موثر حکمرانی کے لیے ناگزیر ہوا کرتی ہے۔

رچرڈ نکسن کے دور میں تقرر کے بعد سپریم کورٹ میں خدمات انجام دینے والے ولیم رہنکوئسٹ نے، جو اِسی وجہ سے سپریم کورٹ کے آٹھ رکنی بینچ کا حصہ نہیں بنے، ۱۹۹۳ء میں، چیف جسٹس کی حیثیت سے اپنے چیمبر میں، مجھے ایک انٹرویو میں بتایا کہ رچرڈ نکسن چاہتے تھے کہ اُن کی گفتگو سے سخت گیری جھلکے، اس لیے وہ کینیڈیز کی طرح بولنے کی کوشش کرتے تھے۔ رچرڈ نکسن کے مستعفی ہوجانے کے بعد کانگریس نے تمام ٹیپس کو نیشنل آرکائیو کا حصہ بنانے کے حق میں ووٹ دیا۔

۱۹۷۰ء کی دہائی میں تین مقدمات کے دوران آڈیو کلپس چلائے گئے تاہم فیڈرل آرکائیوسٹس کی طرف سے پروسیسنگ کے بعد یہ آڈیوز پہلی بار ۱۹۸۸ء میں عوام کے لیے پیش کی گئیں۔ ۲۷ ہزار صفحات پر مشتمل ''فائنڈنگ ایڈ'' کی معاونت سے ''نئے'' ٹیپس کی ریلیز عشروں تک جاری رہی۔

مجھے ۲۰۰۰ میں پہلے پرائیویٹ شہری کی حیثیت سے حساس ترین ٹیپ سُننے کا موقع ملا۔ یہ ٹیپ دسمبر ۱۹۷۱ء کا تھا جب اوول آفس میں رات کے وقت ایک سیشن میں رچرڈ نکسن کو یہ پتا چلا کہ جنگ کے زمانے میں امریکی مسلح افواج کے جوائنٹ چیفس نے پانچ ہزار خفیہ دستاویزات چُراتے ہوئے اُن کی اور قومی سلامتی کے مشیر ہنری کسنجر کی منظم جاسوسی کی تھی! اس ٹیپ میں سُنا جاسکتا ہے کہ اُس وقت کے اٹارنی جنرل جان مچل نے کس طور رچرڈ نکسن سے کہا کہ وہ جاسوسی کا الزام عائد کرنے سے گریز کریں۔

رچرڈ نکسن کی ۲۹/اپریل کی تقریر اور اُس کے بعد عدالتی فیصلے نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا۔ عوامی شخصیات کو نوٹس بھیجے گئے کہ آپ کے خالص نجی خیالات بھی منظرِ عام پر آسکتے ہیں۔ خدا ہی جانے کتنی عوامی شخصیات نے اس انتباہ کو سنجیدگی سے لیا۔ اضافی المیہ یہ ہے کہ اِن ٹیپس کے حقیقی مواد کے بارے میں، جو رچرڈ نکسن کے لیے تباہ کن ثابت ہوا اور جس کی ریلیز نے تمام ہی معاملات پر پانی پھیر دیا، آج تک مکمل اتفاقِ رائے نہیں پایا جاتا۔

ٹیلی فونک گفتگو سے ہٹ کر جو کچھ بھی ریکارڈ کیا گیا وہ اس قدر مبہم اور شور و غوغا سے پُر تھا کہ بٹر فیلڈ کے نگراں چیف آف اسٹاف ایچ آر ہیلڈ مین نے بعد میں لکھا کہ مکمل طور درست ٹرانسکرپٹ جیسی کوئی چیز ہو ہی نہیں سکتی۔ دی جیوڈیشری کمیٹی اور وکلائے استغاثہ نے اپنے الگ ٹرانسکرپشنز جاری کیے۔

اخبارات و جرائد نے واٹر گیٹ اسکینڈل سے متعلق سستی کتابیں (پیپر بیک) شائع کرنے میں ذرا دیر نہ لگائی۔ اِن میں بدترین کتاب تھی ۲۰۱۴ء میں شائع ہونے والی ''دی نکسن ڈیفنس''، جس پر مصنف جان ڈین کا نام تھا۔ یہ کتاب ''نئے'' ٹرانسکرپشنز پر مشتمل تھی جن کی جان ڈین نے تدوین و ادارت کی تھی۔ جان ڈین واٹر گیٹ کا مرکزی سازشی کردار تھا جس کے دغا دے جانے اور غلط گواہی ریکارڈ کرانے سے رچرڈ نکسن اور اُن سے وابستہ شخصیات پر تباہی آئی۔

جان ڈین کی کتاب نے کچھ مواد مسخ کیا، کچھ نکالا، کچھ خلاصے شامل کیے اور یہ سب کچھ کرنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ اس معاملے میں وہ اپنا قصور تھوڑا گھٹا کر دکھا سکے۔

حتمی طور پر ان ٹیپس میں طاقت کے بے جا استعمال والے حصے صرف ۵ فیصد ہیں۔ ڈگلس برنکلے کے ساتھ نکسن ٹیپ ٹرانسکرپٹس کی دو جلدوں کی تدوین و ادارت کرنے والے تاریخ دان لیوک نچٹر نے حال ہی میں بتایا ''اِن ٹیپس سے کھل کر سامنے والی اہم ترین بات یہ ہے کہ صدر ہونا کیا ہوتا ہے۔ کسی بھی صدر کا بیشتر وقت مسائل پر ردِعمل ظاہر کرنے میں کھپ جاتا ہے''۔

کم و بیش ۵۰۰ گھنٹوں کی ریکارڈنگ اب بھی منظرِ عام پر نہیں لائی گئی ہے۔ باقی میں سے بھی اب تک عوام کے سامنے جو کچھ لایا گیا ہے اُس کا صرف ۱۰/فیصد ٹرانسکرپشن کی منزل سے گزرا ہے۔ بہت سے حوالوں سے یہ غیر معمولی دستاویزات آج بھی بہت حد تک راز ہیں اور معمہ ہیں۔

لیوک نچٹر کا کہنا ہے ''نکسن ٹیپس کے بارے میں دوسرے جو کچھ سوچتے ہیں اُس کے بارے میں تو ہمیں بہت کچھ معلوم ہوتا رہتا ہے مگر ہم نہیں جانتے کہ خود نکسن کیا سوچتے تھے۔ کہانیاں کہیں درمیان سے شروع ہوتی ہیں۔ ان کا کوئی آغاز ہوتا ہے نہ انجام''۔

(جیمز روزن ''نیوز میکس'' کے لیے وائٹ ہاؤس نمائندے ہیں اور مصنف بھی۔ ان کی کتابوں میں ''دی اسٹرانگ مین: جان مچل اینڈ دی سیکریٹس آف واٹر گیٹ'' نمایاں ہے۔)

(ترجمہ: ابوصباحت)

"Watergate tapes at 50 are more enigmatic than ever". ("nypost.com". April 27, 2024)

کیا بھارت کی آبادی میں مسلمانوں کا حصہ بڑھا ہے؟

بی جے پی لوک سبھا انتخابات ۲۰۲۴ء میں پہلے ہی مسلمان مخالف مہم چلا رہی ہے۔ پی ایم۔ ای اے سی کی رپورٹ آنے کے بعد میڈیا اس کے کچھ حصوں کا حوالہ دے کر سنسنی خیز خبریں دکھا رہا ہے، جس سے لگتا ہے کہ بی جے پی کے جھوٹے بیانیے کو آگے بڑھایا جا رہا ہے۔ وزیر اعظم نریندر مودی نے گزشتہ ماہ ایک انتخابی ریلی میں مسلمانوں کو 'زیادہ بچے پیدا کرنے والے' کہا تھا۔

وزیر اعظم کی اقتصادی مشاورتی کونسل (پی ایم۔ ای اے سی) کی ایک رپورٹ سرخیوں میں ہے۔ پرانے اعداد و شمار کا استعمال کرتے ہوئے رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ۱۹۵۰ء سے ۲۰۱۵ء کے درمیان ہندوستان کی آبادی میں اقلیتوں کی حصہ داری بڑھی ہے۔ وہیں ہندو آبادی کی حصے داری گھٹی ہے۔ رپورٹ میں اس بات کا ذکر نہیں کیا گیا ہے کہ ۱۹۵۰ء سے ۲۰۱۱ء کے درمیان ہندوستان میں تمام مذہبی گروہوں کی آبادی مسلسل بڑھی تھی۔

اس بات کے شواہد موجود ہیں کہ آبادی میں اضافے یا عدم اضافہ کا براہ راست تعلق خواتین کی خواندگی، ان کے بااختیار ہونے، بچوں کی اموات کی سطح اور دیگر سماجی و اقتصادی پہلوؤں سے ہے۔ اگر پی ایم۔ای اے سی مردم شماری کے انہی پرانے اعداد و شمار کو دیکھے، جس کا وہ حوالہ دے رہا ہے تو پتا چلے گا کہ شمالی ہندوستان میں 'ہندو' اور 'مسلمان' دونوں کی آبادی میں اضافے کی شرح جنوبی ہندوستان کے مقابلے بہت زیادہ ہے۔

رپورٹ میں کیا ہے؟

مردم شماری کے اعداد و شمار کے مطابق، ۱۹۵۱ء میں ہندوؤں کی آبادی ۳۳٫۳۶ کروڑ تھی جو ۲۰۱۵ء میں بڑھ کر ۹۹٫۵۳ کروڑ ہوگئی۔ یعنی اس عرصے میں ہندوؤں کی تعداد میں ۶۹٫۱۷ کروڑ کا اضافہ ہوا۔ جہاں تک مسلمانوں کی تعداد کا تعلق ہے تو ۱۹۵۱ء میں ان کی تعداد ۳٫۵۴ کروڑ تھی جو ۲۰۱۵ء میں بڑھ کر ۱۷٫۷۰ کروڑ ہوگئی۔ یعنی اس عرصے میں مسلمانوں کی تعداد میں ۱۴٫۴۲ کروڑ کا اضافہ ہوا۔

آبادی میں کتنے فیصد حصے داری میں اضافہ ہوا یا کمی واقع ہوئی ہے، اس کو بھی دیکھ لیتے ہیں۔ ملک کی آبادی میں ہندوؤں کی حصے داری ۱۹۵۱ء میں ۸۴٫۹۸ فیصد تھی، جو ۲۰۱۵ء میں کم ہو کر ۷۸٫۰۶ فیصد ہوگئی یعنی آبادی میں ہندوؤں کی حصہ داری ۶٫۹۲ فیصد کم ہوئی۔ اسی عرصے میں مسلمانوں کی حصہ داری ۹٫۹۱ فیصد سے بڑھ کر ۱۴٫۰۹ فیصد ہوگئی۔ یعنی آبادی میں مسلمانوں کی حصہ داری ۴٫۸۱ فیصد بڑھ گئی۔

لیکن ای اے سی کی رپورٹ نہ تو کل آبادی کے فرق پر زور دیتی ہے اور نہ ہی یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ آبادی میں کس کی حصے داری کتنی فیصد بڑھی یا کم ہوئی۔ ای اے سی کی رپورٹ میں ریٹ آف چینج یعنی تبدیلی کی شرح پر زور دیا گیا ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ آبادی میں ہندو اور مسلمانوں کی حصہ داری میں کس شرح سے تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ رپورٹ کے مطابق، ہندوؤں کی آبادی میں تبدیلی کی شرح ۷٫۸ ہے۔ جبکہ مسلمانوں کی آبادی میں تبدیلی کی شرح ۴۳٫۲ ہے۔

مجموعی طور پر پرانے ڈیٹا کو ہی پی ایم۔ای اے سی کی رپورٹ میں نئے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ جہاں کروڑ یا فیصد میں مسلمانوں کی آبادی میں معمولی اضافہ نظر آرہا ہے، وہیں ریٹ آف چینج میں اعداد و شمار میں اضافہ غیر معمولی ہو جاتا ہے۔

آبادی میں اضافہ کو انتخابی مسئلہ بننا ہی تھا

بی جے پی لوک سبھا انتخابات ۲۰۲۴ء میں پہلے ہی مسلم مخالف مہم چلا رہی ہے۔ رپورٹ آنے کے بعد میڈیا اس کے کچھ حصوں کا حوالہ دے رہا ہے اور سنسنی خیز خبریں دکھا رہا ہے، جو کہ بی جے پی کے جھوٹے بیانیے کو آگے بڑھانے جیسا نظر آرہا ہے۔ گزشتہ ماہ ایک انتخابی ریلی میں وزیر اعظم نریندر مودی نے مسلمانوں کو 'زیادہ بچے پیدا کرنے والے' کہا تھا۔

انتخابات سے قبل ہی ایسے اشارے مل رہے تھے کہ آبادی میں اضافہ انتخابی بحث کا محور بن جائے گا۔ وزیر خزانہ نرملا سیتا رمن نے عبوری بجٹ پیش کرتے ہوئے اپنی تقریر میں 'آبادی میں اضافے کے چیلنجز' سے نمٹنے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دینے کی بات کہی تھی۔

تاہم، یہ بیان دیتے ہوئے وزیر خزانہ نے اپنی ہی وزارت کی طرف سے پارلیمنٹ میں پیش کیے گئے اقتصادی سروے ۱۹-۲۰۱۸ء کی باتوں کی تردید کی۔ اقتصادی سروے میں کہا گیا تھا کہ ہندوستان میں اگلی دو دہائیوں میں آبادی میں تیزی سے کمی دیکھنے کو ملے گی۔

وزیر خزانہ نے ۲۰۱۴ء کے لیے عبوری بجٹ پیش کرتے ہوئے اپنی تقریر میں بغیر کسی ڈیٹا کے کہا تھا کہ ہندوستان میں آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ جبکہ ایسا کوئی ڈیٹا نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ ۲۰۱۹ء سے ۲۰۲۴ء کے درمیان ہندوستان کی کم ہوتی آبادی کی شرح بڑھ گئی ہے۔

پاپولیشن فاؤنڈیشن آف انڈیا نے میڈیا رپورٹنگ کو گمراہ کن اور تشویشناک قرار دیا ہے۔ پاپولیشن فاؤنڈیشن آف انڈیا کی ایگزیکٹو ڈائریکٹر پونم متریجا نے کہا ہے کہ 'میڈیا جس طرح مسلمانوں کی آبادی میں اضافہ دکھانے کے لیے اعداد و شمار کو توڑ مروڑ کر پیش کر رہا ہے، وہ غلط بیانی کی ایک مثال ہے۔ ساتھ ہی یہ وسیع تر آبادیاتی رجحانات کو بھی نظر انداز کرتا ہے۔'

فاؤنڈیشن نے کہا ہے کہ 'ہندوستان کی مردم شماری کے مطابق، گزشتہ تین دہائیوں میں مسلمانوں کی آبادی کی شرح نمو میں کمی آرہی ہے۔ ۱۹۹۱ء۔۱۹۸۱ء میں مسلمانوں کی شرح نمو ۳۲٫۹ فیصد تھی، جو ۲۰۱۱ء۔۲۰۰۱ء میں گھٹ کر ۲۴٫۶ فیصد ہوگئی۔ یہ کمی ہندوؤں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ ۱۹۹۱ء۔۱۹۸۱ء میں ہندوؤں کی شرح نمو ۲۲٫۷ فیصد تھی، جو ۲۰۱۱ء۔۲۰۰۱ء میں گھٹ کر ۱۶٫۸ فیصد ہوگئی۔ ۱۹۵۱ء سے ۲۰۱۱ء تک مردم شماری کا ڈیٹا دستیاب ہے۔ اس مطالعے کا ڈیٹا بڑی حد تک مردم شماری کے ڈیٹا سے ملتا ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ ڈیٹا نئے نہیں ہیں۔

ہندوستان کی آبادی میں 'مسلمانوں' کی حصے داری بڑھنے کی سچائی؟

جب نریندر مودی جیسے رہنما مسلمانوں کو ہندوستان کی آبادی میں اضافے کے لیے ذمہ دار ٹھہراتے ہیں، تو وہ نہ صرف ایک کمیونٹی کے ساتھ امتیازی سلوک کر رہے ہوتے ہیں بلکہ غلط بیانی کر رہے ہوتے ہیں۔ بہت سے تجزیوں سے پتا چلتا ہے کہ دیگر مذاہب کی طرح مسلمانوں میں بھی کل زرخیزی کی شرح (ٹی ایف آر) میں گزشتہ چند دہائیوں میں کمی آئی ہے۔

ممبئی میں واقع انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پاپولیشن سائنسز کے سابق سربراہ کے ایس جیمز نے ۲۰۲۱ء میں ایک مضمون میں لکھا تھا کہ ۶۱۔۱۹۵۱ء سے ۲۰۱۱ء۔۲۰۰۱ء کی مردم شماری کے دوران ہندوستان میں تمام مذاہب کے مقابلے مسلمانوں کی آبادی میں سب سے زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ تاہم اس کے باوجود مسلمانوں کی آبادی میں اضافے کی شرح میں سات فیصد اور ہندو آبادی میں اضافے کی شرح میں تین فیصد کی کمی واقع ہوئی۔

مسلمانوں کا روایتی طور پر دوسرے مذہبی گروہوں سے ٹی ایف آر زیادہ تھا، اس لیے فطری طور پر ان میں ٹی ایف آر میں کمی بھی کسی دوسرے گروہ سے زیادہ ہوگی کیونکہ ان میں اس کی گنجائش زیادہ ہے۔

پچھلے سال 'آئیڈیاز فار انڈیا' کی طرف سے کیے گئے ایک تجزیے میں یہ بھی پتا چلا ہے کہ وقت کے ساتھ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ٹی ایف آر کے درمیان فرق کم ہوگیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مختلف مذہبی گروہوں کے لوگوں کے ہاں پیدا ہونے والے بچوں کی تعداد میں فرق کم ہوگیا ہے۔

ہندوستان کی آبادی میں اضافے کی شرح کی حقیقت کیا ہے؟

ہندوستان نے ۲۰۱۱ء کے بعد سے مردم شماری نہیں کی ہے۔ لیکن دیگر عالمی سروے بتاتے ہیں کہ ہندوستان نے آبادی کے لحاظ سے چین کو پیچھے چھوڑ دیا ہے اور اب یہ دنیا کا سب سے زیادہ آبادی والا ملک ہے۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ ۱۹؍جولائی ۲۰۲۲ء کو راجیہ سبھا میں سی پی آئی (ایم) کے رکن پارلیمنٹ جان برٹاس کے ایک سوال کے جواب میں وزیر صحت بھارتی پروین پوار نے دعویٰ کیا تھا کہ مرکزی حکومت آبادی پر قابو پانے میں کامیاب رہی ہے۔ پچھلے دس سالوں میں پارلیمنٹ میں پوچھے گئے کسی بھی سوال کے جواب میں حکومت نے مسلمانوں کو آبادی میں اضافے کی وجہ نہیں مانا ہے۔

دنیا نے بھی ہندوستان کے گرتے ہوئے ٹی ایف آر کا نوٹس لیا ہے۔ یو این ایف پی اے نے نومبر ۲۰۲۲ء میں کہا تھا، 'اچھی خبر یہ ہے کہ ہندوستان کی آبادی میں اضافہ مستحکم ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔۔۔ کُل ۳۱ ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں (جو کہ ملک کی آبادی کا ۶۹٫۷ فیصد ہیں) میں شرح پیدائش ۲٫۱ کی متبادل سطح سے کم پر ہے۔' اس سال مارچ میں دی لانسٹ میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں کہا گیا تھا کہ ہندوستان کا ٹی ایف آر مزید کم ہونے والا ہے۔ یہ ۲۰۲۷ء تک ۱٫۷۵ تک پہنچ سکتا ہے۔

(بحوالہ: ''دی وائر اردو ڈاٹ کام''۔ ۱۰؍مئی ۲۰۲۴ء)

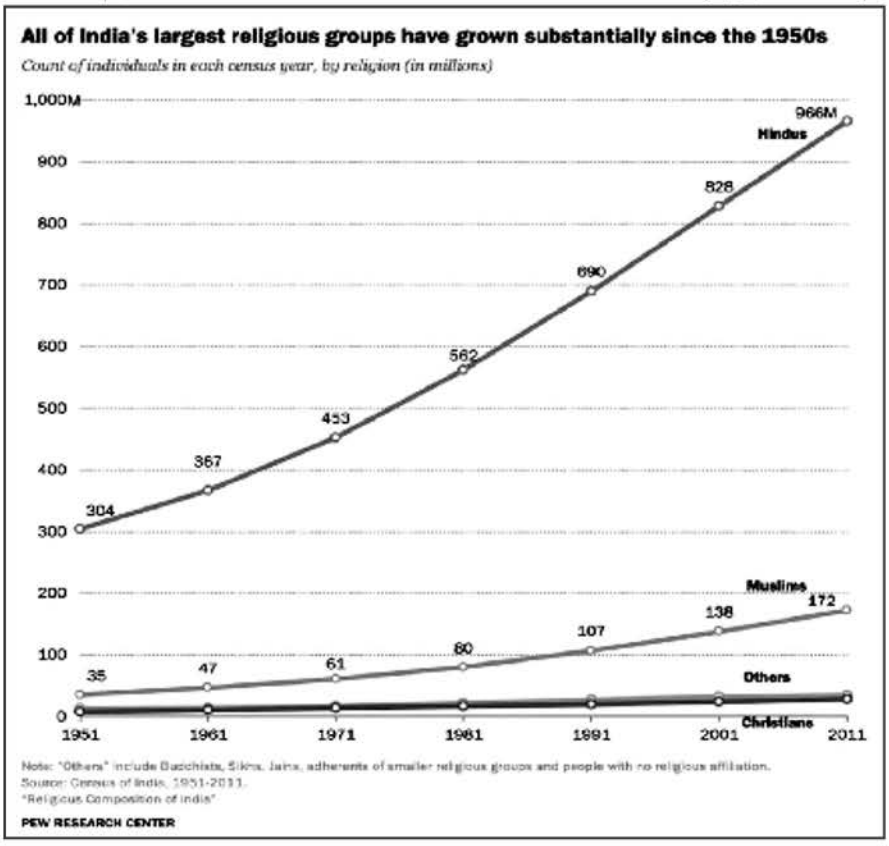

بھارت، ایران چابہار معاہدہ: اور امریکی دھمکی

سہیل انجم

بھارت اور ایران کے درمیان چابہار پورٹ سے متعلق ۱۰؍سالہ معاہدے پر امریکا کی جانب سے پابندی عائد کیے جانے کی دھمکی نے کئی سوالات کھڑے کر دیے ہیں۔ بھارتی تجزیہ کار اس بات کا جائزہ لے رہے ہیں کہ کیا اسے بھارت امریکا تعلقات میں گراوٹ کے طور پر دیکھا جائے یا یہ اقدام ایک دوسرے پر دباؤ ڈالنے کی کوشش ہے۔

بھارت کے وزیر خارجہ ایس جے شنکر نے کہا ہے کہ امریکا کو اس بارے میں تشویش نہیں ہونی چاہیے۔ چابہار اس کے لیے کوئی ایشو نہیں یہ بھارت اور ایران کے درمیان کا معاملہ ہے۔

بھارت اور ایران کے درمیان تہران میں منعقدہ ایک تقریب میں بھارت کے سرکاری ادارے 'انڈیا پورٹس گلوبل لمیٹڈ' (آئی پی جی ایل) اور ایران کے ادارے 'پورٹس اینڈ میری ٹائم آرگنائزیشن آف ایران' (پی ایم او) کے درمیان چابہار بندرگاہ کی مزید تعمیر اور اسے چلانے سے متعلق معاہدے پر دستخط کیے گئے۔ اس موقع پر بھارت کے وزیر برائے جہاز رانی سربانند سونووال اور ایران کے وزیر برائے سڑک وشہری ترقیات مہرداد بذرپاش بھی موجود تھے۔

اس معاہدے کے چند گھنٹے بعد امریکی وزارتِ خارجہ میں نائب ترجمان ویدانت پٹیل نے ایک نیوز بریفنگ میں کہا کہ ہم اس معاہدے سے متعلق رپورٹوں سے آگاہ ہیں۔ جہاں تک امریکا کا تعلق ہے تو ایران پر امریکا کی پابندیاں ہیں۔ ہم نے بارہا کہا ہے کہ اگر کوئی ملک اس سے تجارتی معاہدہ کرتا ہے تو اسے ممکنہ پابندیوں کے خطرے سے آگاہ ہونا چاہیے۔

معاہدے پر دستخط کے بعد ایرانی وزیر نے ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ دونوں ملکوں کے درمیان مشترکہ جہاز رانی منصوبہ شروع کرنے کی بھی تجویز رکھی گئی ہے۔

بھارتی وزیر خارجہ ایس جے شنکر نے معاہدے کا خیر مقدم کیا۔ انھوں نے کہا کہ بھارت اور ایران کے شاہد بہشتی پورٹ ٹرمینل کے آپریشن کے لیے طویل مدتی معاہدے پر دستخط کے بعد چابہار بندرگاہ میں مزید سرمایہ کاری کے مواقع اور روابط پیدا ہوں گے۔ ان کے بقول ابھی بندرگاہ پر کام کا آغاز نہیں ہوا ہے۔ اگر طویل مدتی معاہدہ نہیں ہوتا تو اس میں سرمایہ کاری مشکل ہوتی۔ لہٰذا اس معاہدے کے بعد مزید سرمایہ کاری اور کنکٹیوٹی بڑھے گی۔ چابہار کی وجہ سے ہمارے روابط وسط ایشیا سے قائم ہوں گے۔

سکھ رہنماؤں کے قتل کی سازش اور امریکا، بھارت تعلقات

عالمی امور کے ماہرین کا خیال ہے کہ امریکا کی اس دھمکی کی متعدد وجوہات ہیں۔ بائیڈن انتظامیہ امریکا میں مقیم خالصتانی رہنما گورپتونت سنگھ پنوں کے قتل کی مبینہ سازش اور

کینیڈا میں ایک خالصتانی رہنما ہردیپ سنگھ نجر کے قتل کے سلسلے میں بھارت پر دباؤ ڈالتی رہی ہے۔

عالمی امور کے سینئر تجزیہ کار پروفیسر اے کے پاشا کہتے ہیں کہ بھارت اور امریکا کی جانب سے ایک عرصے سے 'جیسے کو تیسا' والی کارروائی چل رہی ہے۔

امریکا خود بھی اور کینیڈا، آسٹریلیا اور جرمنی کے توسط سے بھی نجر کے قتل اور پنوں کے قتل کی سازش کے سلسلے میں بھارت پر دباؤ ڈال رہا ہے اور مزید بھارتیوں کے ملوث ہونے کی بات کر رہا ہے۔ ان کے مطابق امریکا کی دھمکی سے دونوں ملکوں کے رشتوں پر اثر پڑ سکتا ہے۔

وائس آف امریکا سے گفتگو میں ان کا کہنا تھا کہ امریکا کا بھارتی کمپنیوں پر الزام ہے کہ وہ خفیہ طریقے سے روس کے ساتھ تجارت کر رہی ہیں۔ اس نے روس کی تین سافٹ ویئر کمپنیوں پر پابندی عائد کی ہے۔ اس نے چار ایسی بھارتی کمپنیوں پر بھی پابندی لگائی ہے جو ایران کو ڈرونز کی سپلائی کر رہی ہیں۔

یاد رہے کہ امریکا نے ایران کے ساتھ مبینہ غیر قانونی تجارت کرنے اور ڈرونز کی منتقلی میں سہولت فراہم کرنے پر دنیا بھر کی کچھ کمپنیوں کے ساتھ چار بھارتی کمپنیوں 'زین شپنگ'، 'پورٹ انڈیا پرائیویٹ لمیٹڈ'، 'سی آرٹ شپ مینجمنٹ پرائیویٹ لمیٹڈ' اور 'سہارا تھنڈر' پر پابندی عائد کی ہے۔

اے کے پاشا کے مطابق امریکا بھارت میں انسانی حقوق کی خلاف ورزی کا معاملہ اٹھاتا رہا ہے۔ روس سے بھارت کی تجارت، چین کے سلسلے میں امریکا کے حسب منشا اقدامات سے بھارت کے گریز اور تبت اور تائیوان سمیت کئی معاملات ہیں جن پر وہ مودی حکومت سے ناراض ہے۔

بھارت پر دباؤ ڈالنے کی کوششیں؟

سینئر تجزیہ کار پشپ رنجن بھی ان کی مذکورہ باتوں کی تائید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ سلسلہ مسلسل جاری ہے۔ ان کے بقول ابھی خالصتانی رہنماؤں کا معاملہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ اب یہ دوسرا معاملہ سامنے آ گیا۔

وائس آف امریکا سے گفتگو میں ان کا کہنا تھا کہ دراصل بائیڈن انتظامیہ کچھ ہتھیاروں کے سلسلے میں معاہدے کے لیے بھارت پر دباؤ ڈال رہی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ امریکی صدر جو بائیڈن اس انتخابی سال میں اپنے عوام کو یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ وہ ایران کے معاملے میں دباؤ قائم کیے ہوئے ہیں اور جو کوئی بھی اس سے تجارت کرے گا اس کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا جائے گا۔

ان کے خیال میں سعودی عرب، ایران اور چین کے درمیان جو قربت پیدا ہوئی ہے جو بائیڈن نہیں چاہتے کہ بھارت بھی اس میں شامل ہو جائے۔ لیکن ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ بائیڈن انتظامیہ کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہاں نومبر میں انتخابات ہونے والے ہیں اور اگر اس کے ان اقدامات سے امریکا میں بھارتی تارکینِ وطن ناراض ہو جاتے ہیں تو اس سے جو بائیڈن کو انتخابات میں نقصان اٹھانا پڑ سکتا ہے۔ امریکا میں بھارتی تارکینِ وطن کی تعداد لاکھوں میں ہے۔

اے کے پاشا کا کہنا ہے کہ بھارتی وزارتِ خارجہ کے اہل کار اور سفارت کار کہتے ہیں کہ بھارت ایک آزاد اور خود مختار ملک ہے۔ یہاں اسٹریٹجک خودمختاری ہے، بھارت ایشیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک ہے اور وہ اپنے قومی مفادات کے تحت اقدامات کرتا ہے۔ دوسرے ملکوں کے ساتھ اس کے تعلقات قومی مفادات کی بنیاد پر ہیں۔

چابہار پورٹ معاہدہ

یاد رہے کہ چابہار بندرگاہ کے سلسلے میں معاہدے اور سرمایہ کاری کی بات ۲۰۰۳ء سے ہی جاری تھی۔ لیکن اس میں کوئی پیش رفت نہیں ہو رہی تھی۔ بھارت نے ۲۰۱۳ء میں ۱۰۰ ملین ڈالر کی سرمایہ کاری کی پیش کش کی تھی۔ بھارت کبھی اس معاملے میں تیزی دکھاتا اور کبھی سست ہو جاتا۔

پروفیسر اے کے پاشا کہتے ہیں کہ ایران نے بھارت کو دھمکی دی تھی کہ اگر وہ اس معاملے میں آگے نہیں بڑھتا ہے تو وہ چابہار بندرگاہ کے فروغ کے سلسلے میں گوادر کے طرز پر چین اور پاکستان سے معاہدہ کر لے گا۔

ان کے مطابق بھارت نے اپنا سیاسی وزن متحدہ عرب امارات اور سعودی عرب کے پلڑے میں ڈال دیا ہے جس کی وجہ سے ایران ناراض تھا۔ لہٰذا اس کی دھمکی کی وجہ سے بھارت نے یہ معاہدہ کیا ہے۔

پشپ رنجن بھی پروفیسر پاشا کے اس خیال سے متفق ہیں کہ بائیڈن انتظامیہ مودی حکومت کی واپسی کے حق میں نہیں ہے۔ وہ اس کی وجہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ جو بائیڈن یہ سمجھتے ہیں کہ نریندر مودی کا جھکاؤ ڈونلڈ ٹرمپ کی طرف ہے۔ وہ امریکا میں جا کر 'ہاؤڈی مودی' کے پروگرام میں ٹرمپ کی انتخابی مہم چلا چکے ہیں اور جب ٹرمپ بھارت آئے تھے تو احمد آباد کے مودی اسٹیڈیم میں انھوں نے ان کے ساتھ پروگرام کیا تھا۔

ان کے خیال میں ذاتی طور پر مودی ٹرمپ کے نزدیک ہیں لیکن جو بائیڈن کو چاہیے تھا کہ وہ براک اوباما کے اثر و رسوخ کا استعمال کرتے اور بھارتی تارکینِ وطن کی رائے کو اپنے حق میں ہموار کرتے۔ لیکن وہ ایسا نہیں کر سکے۔

جہاں تک چابہار پورٹ کا معاملہ ہے تو یہ بھارت کے لیے بہت اہم ہے۔ گجرات کے کانڈلہ پورٹ سے چابہار زیادہ دور نہیں ہے۔ بھارت چابہار کے راستے وسط ایشیا تک رسائی حاصل کر لے گا۔ مئی ۲۰۱۶ء میں بھارت، ایران اور افغانستان میں چابہار کے فروغ کے لیے ایک سہ فریقی معاہدہ ہوا تھا۔ بھارت کی کمپنی آئی پی جی ایل نے ۲۰۱۸ء میں بندرگاہ کو چلانے کی ذمہ داری لی تھی لیکن جیو پولیٹیکل صورتِ حال کی وجہ سے اس میں تیز رفتاری نہیں آئی تھی۔

معاہدے کے مطابق بھارت چابہار بندرگاہ کے فروغ کے لیے ۱۲۰ ملین ڈالر کی سرمایہ کاری کرے گا۔ اس نے چابہار سے متعلق بنیادی ڈھانچے کے فروغ کے منصوبوں کے لیے ۲۵۰ ملین روپے کے قرض کی بھی پیشکش کی ہے۔

مبصرین کے مطابق چابہار کا کنٹرول حاصل کرنے کے بعد افغانستان میں سپلائی کے لیے بھارت کو پاکستان کا محتاج نہیں رہنا پڑے گا۔ اسے پاکستان میں گوادر پورٹ کے متبادل کے طور پر دیکھا جا رہا ہے۔

چابہار کا ریڈور بھارت کو ایران اور آذربائیجان کے راستے روس کے سینٹ پیٹرز برگ سے جوڑ دے گا۔ اس کے علاوہ بھارت وسطی ایشیا میں بہت آسانی سے رسائی حاصل کر لے گا۔

(بحوالہ: ''وائس آف امریکا اردو ڈاٹ کام''۔ ۱۴ مئی ۲۰۲۴ء)

بقیہ: برآمدات میں اضافہ پاکستانی معیشت کو بچا سکتا ہے

قومی سیاست و معیشت کی حالت بہت پتلی ہے۔ ہم بہت سے فضول معاملات میں بُری طرح الجھے ہوئے ہیں۔ لازم ہو چکا ہے کہ وقت کے تقاضوں کو سمجھا جائے اور کچھ ایسا کیا جائے جس سے معیشت مستحکم ہو۔ اندرونِ ملک زیادہ گنجائش دکھائی نہیں دیتی۔ ایسے میں بیرونِ ملک ہی کچھ کر دکھانے کا آپشن بچتا ہے۔ ہم اب بھی بہت حد تک عالمگیریت کے دور میں جی رہے ہیں۔ بیشتر ممالک پروٹیکشن ازم یعنی اپنی معیشت کو بچانے کے مرحلے میں داخل ہو چکے ہیں مگر پھر بھی آپسی تجارت کی راہ بالکل مسدود نہیں ہوئی۔ ایک دوسرے سے مدد لیے بغیر اور ایک دوسرے کی مدد کیے بغیر چارہ نہیں۔ اِسی کا نام بین الاقوامی تجارت ہے۔

(ترجمہ: ابوصباحت)

"Pakistan's pharma sector can increase exports to $3bn in five years, but it 'needs policy, govt support'." (brecorder.com". May 17, 2024")

بھارتی انتخابات میں مصنوعی ذہانت (AI) کا استعمال

انجنا پسریچا

دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت بھارت میں، جہاں عام انتخابات اب اپنے اختتام کی طرف بڑھ رہے ہیں، مصنوعی ذہانت کی مدد سے بنائی گئی جعلی ویڈیوز، آڈیوز اور سوشل میڈیا کے تمام ذرائع کا بڑے پیمانے پر استعمال کیا جارہا ہے، سیاسی پارٹیوں اور لیڈروں کے لیے اس کا مقصد زیادہ سے زیادہ ووٹروں تک پہنچنا اور انہیں اپنی جانب راغب کرنا ہے۔

اگر بھارت کی انتخابی صورت حال پر نظر ڈالی جائے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مصنوعی ذہانت سے تیار کردہ تصویروں، آڈیوز اور ویڈیوز نے سیاست دانوں اور امیدواروں کو اپنے ہزاروں ووٹروں کے ساتھ براہ راست رابطہ قائم کرنے میں مدد دی ہے۔ کئی سیاسی جماعتوں نے اپنی انتخابی مہم کو زیادہ پر اثر بنانے کے لیے، پارٹی کے مقبول اور آنجہانی لیڈروں کو ویڈیوز میں مصنوعی ذہانت کی مدد سے دوبارہ زندہ کر کے ووٹروں کو متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ حتیٰ کہ بالی ووڈ کے دو معروف اسٹارز کی فیک ویڈیوز وائرل ہوئیں جن میں وہ وزیراعظم نریندر مودی پر تنقید کرتے ہوئے دکھائی دیے۔ تاہم اسٹارز کی جانب سے لاتعلقی کے اعلان کے بعد یہ ویڈیوز انٹرنیٹ سے ہٹادی گئیں۔

دیویندر سنگھ جدون ڈیپ فیک ویڈیوز بنانے کے ماہر ہونے کے دعویدار ہیں۔ انہوں نے حالیہ مہینوں میں سیاسی جماعتوں کے لیے مصنوعی ذہانت پر مبنی مواد تیار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بھارت میں مصنوعی ذہانت کے اتنے بڑے پیمانے پر استعمال کا یہ پہلا موقع ہے۔

مصنوعی ذہانت سے تیار کردہ انتخابی مواد ایک ایسے ملک میں پھیلایا گیا ہے جہاں ۸۰ کروڑ سے زیادہ لوگوں کی انٹرنیٹ پر رسائی ہے۔ یہ چیز ووٹر کو متاثر کرنے میں کیا کردار ادا کرسکتی ہے؟ اس کے جواب میں نئی دہلی میں قائم ڈیجیٹل رائٹس گروپ 'انٹرنیٹ فریڈم فاؤنڈیشن' کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر پریتک واگھر نے کہا کہ اگر بھارت کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہاں پہلے ہی سے سیاسی جماعتیں اپنے مخصوص بیانیے اور گمراہ کن پیغامات کو آگے بڑھانے پر بہت زیادہ انحصار کرتی ہیں تو اس مصنوعی مواد سے اور کتنا فرق پڑسکتا ہے، اس پر ایک سوالیہ نشان ہے۔

ایک ایسے ملک میں جہاں ہر پارلیمانی حلقے میں تقریباً ۲۰ لاکھ ووٹر ہیں، وہاں جدون اور ان کی ٹیم نے مصنوعی ذہانت کی مدد سے ایسے کردار تخلیق کیے ہیں جو ووٹروں کو ان کا نام لے کر مخاطب کرتے ہیں اور ان کی حمایت حاصل کرنے کے لیے ذاتی نوعیت کے پیغامات پہنچاتے ہیں۔ اس کے علاوہ مصنوعی ذہانت پر کام کرنے والے روبوٹس ہیں جو سیاسی رہنماؤں کی آواز میں ووٹروں کو ان کے ٹیلی فون پر کال کرتے ہیں اور اپنے حق میں ووٹ ڈالنے کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں۔

جدون کہتے ہیں کہ ٹیکنالوجی کی ترقی اور ارزانی نے مصنوعی ذہانت کا بڑے پیمانے پر استعمال ممکن بنادیا ہے۔ چار سال پہلے تک ہمیں مصنوعی ذہانت کی ایک منٹ کی ویڈیو بنانے میں کئی دن لگ جاتے تھے۔ اب ایک عام شخص جسے ڈیجیٹل کوڈنگ کی اے بی سی کا بھی علم نہ ہو، وہ بڑی آسانی سے ایک شخص کی تصویر بنا کر اس میں آواز ڈال سکتا ہے۔

آنجہانی رہنماؤں کو مصنوعی ذہانت کی ویڈیوز میں زندہ کرنے کی ایک نمایاں مثال جنوبی ریاست تامل ناڈو کی ہے۔ اس ریاست میں اب ووٹنگ ختم ہوچکی ہے۔ وہاں کے ایک مقبول لیڈر میتھول کروناندی تھے، جن کا ۲۰۱۸ء میں انتقال ہوگیا تھا۔ ان کے بیٹے ایم کے اسٹالن ریاست کے وزیراعلیٰ ہیں۔ ان کی انتخابی مہم کے لیے ان کے والد کروناندی کو مصنوعی ذہانت کی ویڈیوز میں دوبارہ زندہ کیا گیا ہے، وہ اپنا مخصوص سیاہ چشمہ پہنے، اپنے بیٹے کے حق میں کنوینسنگ کرتے ہوئے نظر آئے۔

بھارت میں الیکشن کے دوران جھوٹی خبریں پھیلانے کے لیے مصنوعی ذہانت کا استعمال بدستور ایک بڑا چیلنج بنی رہی۔ بالی وڈ اسٹارز کی جعلی ویڈیوز کا ذکر تو ہم کرہی چکے ہیں جن میں نریندر مودی کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اسی طرح کی ایک فیک ویڈیو حزب اختلاف کی بڑی پارٹی کانگریس کے رہنما راہول گاندھی کی تیزی سے وائرل ہوئی جس میں وہ یہ کہتے ہوئے نظر آئے کہ انہوں نے اپنی پارٹی سے استعفیٰ دے دیا ہے۔

جدون کہتے ہیں کہ ایسی فیک ویڈیوز کے لیے عموماً کیا یہ جاتا ہے کہ ان کا چہرہ کسی اور کردار پر چسپاں کردیا جاتا ہے جس کا مقصد ان کی ساکھ کو نقصان پہنچانا ہوتا ہے۔ ایک اور طریقہ یہ ہے کہ ان کی تصویر کے ساتھ ایسے بیانات لگا دیے جاتے ہیں، جو انہوں نے کبھی دیے ہی نہیں ہوتے۔ ایک اور طریقہ یہ ہے کہ ان کی آواز کی نقل بنا کر ایسا کچھ کہا جاتا ہے جس سے انہیں سیاسی نقصان پہنچ سکے۔

مصنوعی ذہانت سے تیار کی گئی ایک دلچسپ ویڈیو ریاست تامل ناڈو میں پھیلائی گئی، جس میں نریندر مودی تامل ناڈو میں مقبول ایک گانا گاتے ہوئے نظر آئے۔ اس ویڈیو کا مقصد تامل ووٹر کو بھارتیہ جنتا پارٹی کی حمایت پر مائل کرنا تھا۔

بھارت کے الیکشن کمیشن نے سیاسی جماعتوں کو غلط معلومات پھیلانے کے لیے مصنوعی ذہانت کے استعمال سے خبردار کیا ہے لیکن اس پر کنٹرول کے لیے بہت کم ضابطے موجود ہیں۔

بھارت کے انتخابات میں ڈیجیٹل دنیا سے شامل ہونے والی واحد چیز مصنوعی ذہانت ہی نہیں ہے بلکہ سیاسی جماعتوں اور انتخابی امیدواروں نے یوٹیوب اور انسٹاگرام کا بھی بھرپور استعمال کیا ہے۔

بھارتیہ جنتا پارٹی سوشل میڈیا کی طاقت سے بخوبی آگاہ ہے اور وہ اس میڈیم کے استعمال میں دوسری پارٹیوں سے آگے رہی ہے۔ مارچ میں الیکشن شروع ہونے سے صرف پانچ ہفتے قبل وزیراعظم مودی نے ملک کے پہلے تخلیقی ایوارڈز کی تقریب میں سوشل میڈیا کی ۲۴ معروف شخصیات کو ایوارڈ دیے تھے جس کا مقصد نئے بھارت کے پراعتماد اور پرعزم کہانی کاروں کی حوصلہ افزائی بتایا گیا تھا۔ لیکن ناقدین نے ان ایوارڈز کو حکمران جماعت کی انتخابی مہم کا ساتھ دینے کی ایک کوشش کے طور پر دیکھا۔

واگھر کہتے ہیں کہ اس ٹیکنالوجی کا فائدہ یہ ہے کہ سیاست دان اپنا پیغام ان لوگوں تک اسی انداز میں پہنچاسکتے ہیں، جیسا وہ چاہتے ہیں اور وہ بھی ایک قریبی تعلق کے ساتھ۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس حربے کو مؤثر طور پر استعمال کرنا مشکل ہوتا جائے گا۔

(بحوالہ: ''وائس آف امریکا اردو ڈاٹ کام''۔ ۲۲ مئی ۲۰۲۴ء)

○○○

بقیہ: امریکا کے لیے پھر خطرے کی گھنٹی بج گئی؟

میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ روس کی عسکری قوت اب بھی اتنی ہے کہ یورپ کسی بڑی جنگ کے بارے میں سوچ کر کانپ اٹھتا ہے۔ ایسے میں امریکا کے لیے خطرے کی گھنٹی بج ہی چکی ہے۔ اب اُسے یورپ کے ساتھ مل کر کوئی ایسی راہ منتخب کرنا ہوگی جس پر چلتے ہوئے عسکری مناقشات سے بچنا ممکن ہو۔

(مضمون کی تیاری میں ''انڈیا ٹوڈے''، ''دی ٹیلی گراف'' سے مدد لی گئی ہے)

نریندر مودی کے انتخابی مہم کے دوران ۸۰ انٹرویو

سہیل انجم

بھارت کے دارالحکومت نئی دہلی میں اس وقت سیاسی و صحافتی حلقوں میں جہاں لوک سبھا انتخابات کا ممکنہ نتیجہ موضوع گفتگو ہے، وہیں انتخابی مہم کے دوران وزیر اعظم نریندر مودی کے الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کو دیے گئے ۸۰/انٹرویوز کا معاملہ بھی زیر بحث ہے۔

یہ سوال بھی اٹھایا جا رہا ہے کہ جہاں مودی نے اتنے انٹرویو دیے ہیں، وہیں سینئر کانگریس رہنما راہل گاندھی نے ایک بھی انٹرویو کیوں نہیں دیا؟

سیاسی مبصرین کا کہنا ہے کہ انتخابی مہم کے دوران انٹرویو کے لیے وقت نکالنا مشکل ہوتا ہے۔ اس کے باوجود وزیر اعظم مودی کے اتنے زیادہ انٹرویو حیرت زدہ کر دیتے ہیں۔ وزیر اعظم نے یہ انٹرویو نیشنل میڈیا کو بھی دیے۔ علاقائی اخباروں اور نشریاتی اداروں پر بھی ان کے انٹرویو شائع اور نشر ہوئے۔

علاقائی زبانوں کے میڈیا اداروں کی جانب سے کیے جانے والے سوالوں کے جواب بھی مودی نے ہندی میں دیے جن کا ترجمہ کر کے پیش کیا گیا۔

وزیر اعظم نریندر مودی، سونیا گاندھی، راہل گاندھی اور پرینکا گاندھی کا انٹرویو کرنے والی سینئر صحافی اور نشریاتی ادارے 'سی این این نیوز ۱۸' میں سینئر ایڈیٹر پلوی گھوش کا کہنا ہے کہ وزیر اعظم نے انٹرویوز کی مدد سے عوام سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔

وائس آف امریکا سے گفتگو میں پلوی گھوش کا کہنا تھا کہ وزیر اعظم مودی پر ہمیشہ یہ الزام لگتا رہا ہے کہ وہ پریس کانفرنس یا میڈیا سے بات نہیں کرتے۔ لہٰذا انہوں نے نہ صرف نیشنل میڈیا کو انٹرویوز دیے بلکہ مقامی زبانوں کے میڈیا اداروں کو بھی دیے ہیں۔ ان انٹرویوز کا ایک مقصد جہاں عوام سے رابطہ قائم کرنا ہے وہیں اس الزام کا جواب بھی دینا ہے۔

ان کے مطابق ان کے انٹرویوز کی خاص بات یہ رہی کہ جس ریاست میں انتخابات ہونے والے تھے، انہوں نے اسی ریاست میں اور مقامی زبان کے کسی میڈیا ادارے کو انٹرویو دیا۔

کچھ مبصرین کا خیال ہے کہ انتخابی مہم کے دوران انٹرویوز دینے کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہوتا۔ کیوں کہ عوام پہلے سے ہی ایک ذہن بنا چکے ہوتے ہیں۔ بعض مبصرین کے نزدیک کچھ ووٹر ایسے بھی ہوتے ہیں جو پہلے سے کوئی فیصلہ کرنے کے بجائے پولنگ سے عین قبل فیصلہ کرتے ہیں۔ لہٰذا ان انٹرویوز کا کچھ تو فائدہ ہوتا ہی ہے۔

پلوی گھوش کہتی ہیں کہ انتخابی مہم کے دوران لوگ بڑے رہنماؤں کے انٹرویوز کو پڑھتے، سنتے اور دیکھتے ہیں۔ اخباروں اور نیوز چینلوں کو دیے جانے والے انٹرویو سوشل میڈیا کے توسط سے وائرل ہوتے ہیں، وٹس ایپ گروپوں میں شیئر ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس کا فائدہ تو ہوتا ہے اور جتنے زیادہ انٹرویو دیے جائیں گے عوام کے اتنا ہی قریب پہنچا جا سکے گا۔

واضح رہے کہ کانگریس کے سینئر رہنما راہل گاندھی نے اس انتخابی مہم کے دوران نیشنل میڈیا کو ایک بھی انٹرویو نہیں دیا۔ ان کا جھکاؤ سوشل میڈیا کی جانب زیادہ ہے۔

وہ الزام عائد کرتے ہیں کہ مودی نے جتنے بھی انٹرویوز دیے ہیں ان کے سوال و جواب پہلے سے طے شدہ تھے۔ بلکہ انہوں نے انٹرویو کرنے والے صحافیوں کو 'چمچے' قرار دیا ہے۔

کانگریس کا دعویٰ ہے کہ وزیر اعظم مودی کے بیشتر انٹرویوز وزیر اعظم کے دفتر پی ایم او میں ہوئے ہیں۔ لائٹ، کیمرہ، ایڈیٹنگ، سوال، جواب سب کچھ پی ایم او کا تھا۔

کانگریس کے مطابق انٹرویو کرنے والے خالی ہاتھ جاتے تھے اور انٹرویو کر کے خالی ہاتھ واپس آ جاتے تھے۔ بعد ازاں پی ایم او سے ایڈیٹڈ انٹرویوز بھیج دیے جاتے۔

بعض صحافیوں نے اس کی تردید کی ہے۔ ایک نشریاتی ادارے 'نیوز ۲۴' کے اینکر پرسن مانک گپتا نے اس بارے میں ایک سینئر صحافی اجیت انجم کے الزام کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ ان کا لیا ہوا انٹرویو فلکسڈ نہیں تھا۔

کانگریس کے سابق رکن پارلیمان شمیم ہاشمی کے سابق میڈیا منیجر اور سینئر صحافی سید رومان ہاشمی کا کہنا ہے کہ انتخابی مہم کے دوران کیے جانے والے انٹرویوز کا اثر سیاست دان اور اس سے کیے جانے والے سوال و جواب پر ہے۔ یعنی کس سیاست دان کا انٹرویو کیا گیا، کیا سوال پوچھا گیا اور جواب کیا دیا گیا۔

وائس آف امریکا سے گفتگو میں ان کا کہنا تھا کہ اگر کوئی سیاسی رہنما غیر اہم ہے اور اس سے سوال بھی غیر اہم کیے جا رہے ہیں تو اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ان کے مطابق مودی سے کیے جانے والے تمام انٹرویوز تقریباً ایک جیسے ہیں۔

ان کے بقول ان انٹرویوز میں اسی طرح کے سوال کیے گئے جیسے کہ ایک بار فلمی اداکار اکشے کمار نے کیا تھا اور مودی سے پوچھا تھا کہ آپ آم کاٹ کر کھاتے ہیں یا چوس کر۔

ان کے مطابق ان انٹرویوز میں بھی اسی قسم کے سوالات ہیں کہ آپ تھکتے کیوں نہیں۔ آپ کے اندر اتنی طاقت کہاں سے آتی ہے۔ لہٰذا ان انٹرویوز کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

ان کا کہنا تھا کہ ان انٹرویوز سے وزیر اعظم مودی کو نقصان پہنچا ہے۔ ان کے بارے میں جو یہ ایک عام تاثر ہے کہ وہ ایک ڈکٹیٹر کے مانند حکومت کرتے ہیں۔ ان انٹرویوز سے یہ تاثر اور مستحکم ہوا ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ ان کے انٹرویوز دیکھنے والے یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ صحافی ان سے کیسے سوال کر رہے ہیں۔ کیا وہ سخت اور مشکل سوال ہیں یا پھر ان کو خوش کرنے والے سوالات ہیں۔ ان کے مطابق سوالات بھی کمزور ہیں اور جوابات بھی کمزور ہیں۔

بعض سیاسی مبصرین کا کہنا ہے کہ وزیر اعظم کے انٹرویوز سے کانگریس کا یہ الزام ختم نہیں ہو جاتا کہ وہ پریس کانفرنس نہیں کرتے۔ انہوں نے انٹرویوز ۸۰ دے دیے اور اپنے پسندیدہ چینلوں اور صحافیوں کو دیے۔ لیکن پریس کانفرنس ایک بھی نہیں کی۔

یاد رہے کہ سینئر صحافی رویش کمار نے اپنے یوٹیوب پلیٹ فارم 'رویش کمار آفیشل' پر مودی کے انٹرویوز پر ایک پروگرام میں کہا کہ اتنے سارے انٹرویوز میں سے اسٹوری کوئی نہیں نکل رہی ہے، صرف انٹرویو دیے جا رہے ہیں۔ رومان ہاشمی کے مطابق یہ انٹرویوز دونوں کی قابلیت پر سوال کھڑا کرتے ہیں۔

سال ۲۰۱۹ء کی انتخابی مہم کے موقع پر راہل گاندھی کا انٹرویو کرنے والی پلوی گھوش نے اپنی ایک رپورٹ میں لکھا ہے کہ راہل نے ۲۰۱۹ء کے انتخابات کے بعد انٹرویو کی ہر درخواست کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ ان کے پاس میڈیا کو بتانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔

پلوی گھوش کے خیال میں راہل گاندھی کے قومی میڈیا کو انٹرویو نہ دینے کی سب سے بڑی وجہ عدم اعتماد ہے۔ انھیں قومی میڈیا پر، کوئی بھروسہ نہیں رہا۔ کانگریس کا یہ بھی خیال ہے کہ راہل کے امیج کو خراب کرنے میں قومی میڈیا کا بڑا ہاتھ ہے۔

خیال رہے کہ ۲۰۱۴ء کے بعد کے قومی میڈیا کو 'گودی میڈیا' کا خطاب رویش کمار نے دیا جو اب بہت مقبول ہو گیا ہے۔

////// باقی صفحہ نمبر ۴ \\\\\\

امریکیوں کا ”جمہوری مزاج“

دنیا بھر میں جمہوریت کی عظمت اور قانون کی بالادستی کے راگ الاپنے والے امریکی شہریوں کی اپنی ذہنی حالت کیا ہے، اِس کا اندازہ زیرِنظر مضمون سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے جو بھارتی جریدے ”انڈیا ٹوڈے“ کی ویب سائٹ نے متعدد ذرائع سے حاصل شدہ معلومات کی بنیاد پر مرتب کیا ہے۔

اپنے محبوب لیڈر کو سنائی جانے والی سزا پر مشتعل ہونا حیرت انگیز نہیں مگر امریکا میں ری پبلکن پارٹی کے طرف داروں نے تو اخلاقی اور قانونی حدیں پار کرلی ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے ٹرمپ کو سزائے موت سنادی گئی ہے۔ بعض پسماندہ ممالک میں کسی لیڈر کو سنائی جانے والی سزا پر شدید ردِعمل ضرور ہوتا ہے مگر جج یا ججوں کو نشانہ بنانے کی بات نہیں کی جاتی۔

نیویارک کی عدالت کی طرف سے ٹرمپ کو سزا سنائے جانے کے بعد سوشل میڈیا پلیٹ فارمز پر ملک اور ریاست کے خلاف پوسٹوں کی بھرمار ہے۔ ٹرمپ کے بہت سے حامیوں نے ملک گیر سول نافرمانی کی کال دی ہے۔ وہ کہتے ہیں ٹرمپ کو سنائی جانے والی سزا کسی بھی حال میں قابلِ قبول نہیں۔ اس معاملے میں برائے نام بھی رواداری اور برداشت کا مظاہرہ نہیں کیا جارہا۔

ایک طرف تو لوگوں سے کہا جارہا ہے کہ حکومتی اور ریاستی مشینری کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں اور دوسری طرف ٹرمپ کو سزا سنانے والی جیوری کو سبق سِکھانے اور جج جوآن مرچن کو پھانسی دینے کا مطالبہ کیا جارہا ہے۔ یہ سب کچھ انتہائی عجیب ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے امریکا کو جان بوجھ کر شدید نوعیت کی نراجیت کی طرف دھکیلا جارہا ہے۔

امریکا کے سابق صدر ڈونلڈ ٹرمپ کو عدالت کی طرف سے ’منہ بند رکھنے کے لیے دی جانے والی رقم‘ کے کیس میں سزا سنائے جانے کے بعد امریکا بھر میں ٹرمپ کے حامیوں نے ہنگامہ آرائی تیز کردی ہے۔ سوشل میڈیا کی پوسٹوں کے ذریعے مکمل سول نافرمانی کی کال دی جارہی ہے۔ یہ گویا ملک میں قانون کی عملداری کو چیلنج کرنا ہے۔

ٹرمپ کے حامیوں نے احتجاج کے دوران قوانین کی شدید خلاف ورزیاں کی ہیں اور سرکاری املاک کو نقصان پہنچانے سے بھی گریز نہیں کیا۔ سوشل میڈیا پوسٹوں میں ٹرمپ کو سزا سنانے والی جیوری کے ارکان کو زدوکوب کرنے اور جج جوآن مرچن کو پھانسی دینے کی کال بھی دی جارہی ہے۔ امریکا میں بہت سے سرکردہ سیاسی تجزیہ کار بھی حیران ہیں کہ عوام کے جذبات اس حد تک کیسے بھڑک سکتے ہیں۔ سیاسی اختلاف اپنی جگہ، احتجاج بھی درست مگر ریاست کی بنیادیں ہلانے کی باتیں؟ یہ تو حد ہی ہوگئی۔

ٹرمپ کے حامی مکمل سول نافرمانی کی تحریک چلانے اور خوں ریز انقلاب برپا کرنے کی بھی بات کر رہے ہیں۔ انہوں نے سوشل میڈیا کے ذریعے ملک بھر میں ہنگامہ آرائی کا بازار گرم کرنے کی کال دی ہے۔

ڈونلڈ ٹرمپ واحد سابق امریکی صدر ہیں جنہیں کسی کیس میں سزا سنائی گئی ہے۔ سزا سنائے جانے کے بعد سوشل میڈیا پر طوفان سا برپا ہوگیا۔ حامیوں کے سوشل میڈیا اکاؤنٹس کے علاوہ خود ڈونلڈ ٹرمپ کے سوشل میڈیا پلیٹ فارمز ٹروتھ سوشل، پیٹریاٹس ڈاٹ وِن اور گیٹ وے پنڈت پر بھی ہنگامہ آرائی پر اُکسانے والی پوسٹیں لگائی گئی ہیں۔

ٹرمپ کے حامیوں نے سوشل میڈیا پلیٹ فارمز کے ذریعے ہتھیار اٹھانے اور ریاست کے مقابل آنے کی کال دی ہے جس پر ملک بھر میں شدید عوامی ردِعمل بھی پایا جاتا ہے۔ ڈیموکریٹس نے محکمہ انصاف سے کہا ہے کہ وہ سوشل میڈیا پر انتہا پسندانہ اور ریاست مخالف پوسٹوں کا نوٹس لیتے ہوئے معاملات کو درست کرنے کے اقدامات کرے۔

”گیٹ وے پنڈت“ پر ایک پوسٹ میں کہا گیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ بائیں بازو کے (لبرل) عناصر کو موت کے گھاٹ اتارا جائے کیونکہ یہ لوگ جمہوری طریقوں سے سُدھرنے والے نہیں۔ ۲۰۲۰ء کے صدارتی انتخاب میں ڈونلڈ ٹرمپ کی شکست کے بعد بھی ری پبلکن پارٹی کے حامیوں نے بہت بڑے پیمانے پر ہنگامہ آرائی کی تھی اور ملک کی تاریخ میں پہلی بار دارالحکومت واشنگٹن میں کلیدی ریاستی عمارتوں پر دھاوا بولا تھا۔ سوشل میڈیا پر ایک پوسٹ میں کہا گیا ہے کہ اگر کسی کا نیویارک میں کچھ بھی داؤ پر نہیں لگا تو جج جوآن مرچن کا حال پوچھنے میں کچھ ہرج نہیں۔

ٹرمپ کے حامیوں کی ویب سائٹس کے علاوہ خود ٹرمپ کی تین ویب سائٹس (پیٹریاٹس ڈاٹ وِن، گیٹ وے پنڈت اور ٹروتھ سوشل) پر بھی ریاست مخالف مواد موجود ہے۔ ایک پوسٹ میں لکھا گیا کہ ایک لاکھ مسلح افراد واشنگٹن پر دھاوا بولیں اور سب کو لٹکا دیں۔ ایک اور پوسٹ میں کہا گیا کہ لبرل عناصر کا علاج صرف اسلحے سے ممکن ہے۔

۳۱ مئی کو بارہ رکنی جیوری نے ہَش منی کیس میں قرار دیا تھا۔ سزا کے لیے ۱۲ر جولائی کا تعین کیا گیا ہے۔ اس کے چند ہی دن بعد ری پبلکن پارٹی ڈونلڈ ٹرمپ کو باضابطہ صدارتی امیدوار مقرر کرنے والی ہے۔ ایک مبصر نے جج جوآن مرچن کو نظامِ انصاف کا غدار غنڈا قرار دیا۔ ”گاڈ، گنز اینڈ سیڈیشن“ نامی کتاب کے مصنف جیکب ویئر نے کہا کہ مان لینا چاہیے کہ سابق امریکی صدر لوگوں کے جذبات بھڑکانے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔ جیکب ویئر جو کونسل آن فارن ریلیشنز کے ریسرچ فیلو بھی ہیں، مزید کہا کہ جب تک ڈونلڈ ٹرمپ قانون کی بالادستی تسلیم نہیں کریں گے تب تک اُن کے عدالتی معاملات میں عسکریت پسندی کا عنصر موجود رہے گا۔

”ٹروتھ سوشل“ نے برطانوی خبر رساں ادارے ”رائٹرز“ کی رپورٹنگ پر تنقید کی اور کہا کہ چند قابلِ اعتراض پوسٹ بعد میں ڈیلیٹ کردی گئیں۔ ”پیٹریاٹس ڈاٹ وِن“ اور ”گیٹ وے پنڈت“ نے استدعا کے باوجود کوئی رائے دینے سے گریز کیا۔ فیصلے کے بعد سوشل میڈیا پر لکھا گیا کہ امریکی سیاسی نظام تباہ ہوچکا ہے اور یہ کہ اب تو صرف تشدد ملک کو بچا سکتا ہے۔ ”پیٹریاٹس ڈاٹ وِن“ پر ایک پوسٹ میں لکھا گیا کہ ٹرمپ کو یاد رکھنا چاہیے کہ اُن کی ایک ”فوج“ ہے جو ایک اشارے پر ہتھیار اٹھانے اور لڑنے، مرنے کے لیے تیار ہے۔

محققین اور ماہرین کا کہنا ہے کہ ٹرمپ کے خلاف فیصلے کے بعد جو کچھ بھی سوشل میڈیا پر دکھائی دیا ہے، وہ انتہائی پریشان کن ہے، اس طرف سے آنکھیں بند نہیں کی جاسکتیں۔ امریکی معاشرے میں انتشار پہلے ہی موجود ہے۔ نسل پرستی مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی ہے۔ ایسے میں اگر سیاسی بنیاد پر انتشار پھیلانے کی کوشش کی گئی تو خرابیوں کا ایسا سلسلہ شروع ہوگا جس پر قابو پانا کسی کے بس میں نہ ہوگا۔

مڈل بری انسٹیٹیوٹ آف انٹرنیشنل اسٹڈیز کے سینٹر فار ٹیررازم، ایکسٹریمزم اینڈ کاؤنٹر ٹیررازم کے محقق ایمی کُوٹر کہتے ہیں ”فی زمانہ تشدد کے لیے کسی کو اُکسانے اور چابی بھرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ لوگ بھرے ہی رہتے ہیں۔ اب کسی بھی

////// باقی صفحہ نمبر ۶ \\\\\\

برآمدات میں اضافہ ہی پاکستانی معیشت کو بچاسکتا ہے

بلال حسین

غیر معمولی معاشی مشکلات نے پاکستان کو یوں جکڑ رکھا ہے کہ اب جان چھڑانا انتہائی دشوار دکھائی دیتا ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ کسی بھی سطح پر معیاری منصوبہ سازی دکھائی نہیں دے رہی۔ اگر کہیں تھوڑی بہت منصوبہ سازی ہو بھی تو اُس کی تعمیل کی صورت نظر نہیں آتی کیونکہ اس حوالے سے عزمِ محکم نہیں پایا جاتا۔

اس دور میں بھی کئی شعبے ہیں جن میں اپنی پوزیشن بہتر بنائی جاسکتی ہے۔ قومی معیشت کو فروغ دینے والے عوامل میں برآمدات کا غیر معمولی کردار ہے۔ دنیا بھر میں حکومتیں برآمدات بڑھانے پر متوجہ رہتی ہیں۔ دنیا مینوفیکچرنگ سے ہوتی ہوئی خدمات کی طرف جاچکی ہے۔ ہم اب تک مینوفیکچرنگ سیکٹر میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اگر آئی ٹی اور دیگر معلقہ شعبوں میں غیر معمولی مہارت یقینی بنائی جائے تو برآمدات کو قابلِ رشک حد تک فروغ دینا کچھ مشکل نہیں۔ بھارت اس کی بہت واضح مثال ہے۔ خیر، یہ ایک الگ موضوعِ بحث ہے۔

پاکستان کے جن سیکٹرز میں آگے جانے کی سکت پائی جاتی ہے اُن میں فارماسیکٹر نمایاں ہے۔ ہمارا فارماسیکٹر پانچ سال میں اپنی برآمدات کو ۳؍ارب ڈالر تک لے جاسکتا ہے تاہم اِس کے لیے حکومت کی طرف سے معقول و بروقت معاونت اور موزوں پالیسی کا تعین ناگزیر ہے۔ اگر حکومت جامع پالیسیاں مرتب کرے اور اُن پر عمل کے حوالے سے سنجیدہ ہو تو علاقائی اور عالمی دونوں ہی منڈیوں میں اپنے آپ کو منوایا جاسکتا ہے۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ ایک ایسے وقت کہ جب پاکستان قرضوں سے ہٹ کر زرِمبادلہ حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے، متعدد شعبوں میں برآمدات بڑھانے کی گنجائش ہے۔ انہوں نے اس معاملے کو ایسے درخت سے تشبیہ دی ہے جس پر پکے ہوئے پھل لٹک رہے ہیں مگر توڑے نہیں جارہے۔ کیا واقعی ایسا ہے؟ کیا برامدات میں اضافہ ایسا ہی آسان ہے جیسا بتایا جارہا ہے؟

اپریل میں ختم ہونے والے مالی سال میں بھارت کے فارما سیکٹر کی برآمدات ۲۸؍ارب ڈالر کے مساوی تھیں۔ یہ بات فارماسیوٹیکل ایکسپورٹ پروموشن کونسل نے بتائی ہے جبکہ مالی سال ۲۳-۲۰۲۲ء میں پاکستان کی فارماسیکٹر کی برآمدات صرف ۷؍کروڑ ۳۰ لاکھ ڈالر رہی تھیں۔ یہ فرق صرف اس لیے ہے کہ ہم منصوبہ سازی نہیں کرتے اور قومی معیشت کو فروغ دینے کے حوالے سے اپنی صلاحیت وسکت کو بروئے کار لانے کی وہ کوشش نہیں کرتے جو کرنی چاہیے۔ پاکستانی جب انفرادی حیثیت میں بیرونِ ملک جاتے ہیں تو اپنے آپ کو خوب منواتے ہیں۔ تو پھر اجتماعی سطح پر ہم اپنے آپ کو کیوں منوا نہیں سکتے؟

ایک سرکاری عہدیدار نے بتایا کہ فارماسیکٹر میں برآمدات کو فروغ دینے کے لیے ناگزیر ہے کہ حکومت موزوں پالیسی تیار کرکے نافذ کرے اور اس سلسلے میں فارماسیکٹر کی معاونت بھی کرے۔ معیشت کے دیگر شعبوں کی طرح دواسازی کو بھی حکومتی سرپرستی کی ضرورت ہے۔ دنیا میں کوئی بھی ملک ایسا نہیں جس کی برآمدات سرکاری سرپرستی کے بغیر پروان چڑھی ہوں۔ حکومتیں جب برآمدات کو فروغ دینے کا ذہن بناتی ہیں تب کچھ ہو پاتا ہے۔ ہمارے ہاں یہ منزل ابھی بہت دور دکھائی دیتی ہے۔

روزنامہ بزنس ریکارڈر سے ایک انٹرویو میں پاکستان فارما سیوٹیکل مینوفیکچررز ایسوسی ایشن (پی پی ایم اے) کی سابق چیئرپرسن نے کہا کہ ایسی ڈرگ ریگولیٹری اتھارٹی کی ضرورت ہے جو تجارتی معاملات سے اچھی طرح واقف ہو اور ساتھ ہی ساتھ حکومت بھی متعلقہ شعبے کو اپنے تعاون سے نوازے۔

سرکاری عہدیدار نے کہا کہ ڈرگ ریگولیٹری اتھارٹی آف پاکستان (ڈریپ) میں تجارت کی سمجھ بوجھ رکھنے والے نہیں۔ اس کے نتیجے میں فارماسیکٹر کی برآمدات کو بڑھایا نہیں جاسکا ہے۔ اس عہدیدار نے ڈریپ کو مشورہ دیا کہ ٹریڈ ڈیولپمنٹ اتھارٹی آف پاکستان (ٹڈاپ) اور وزارتِ تجارت سے اشتراکِ عمل کرے تاکہ برآمدات میں اضافہ ممکن بنایا جاسکے۔ عہدیدار کا کہنا تھا کہ ڈریپ میں دواسازی کے ماہرین اور ڈاکٹرز بھی ہیں جو اہم عہدوں پر کام کررہے ہیں۔ یہ ایک ٹیکنیکل ادارہ ہے۔ یہ سب لوگ تکنیکی سطح پر تو بہت اچھا کام کررہے ہیں مگر تجارتی معاملات میں کمزور ہیں۔ اس کے نتیجے میں یہ برآمدات میں اضافے کے حوالے سے کچھ خاص نہیں کرپارہے۔

مذکورہ سرکاری عہدیدار نے پاکستان کی تیار کردہ دوائیں بیرونِ ملک متعارف کرانے کے حوالے سے سیالیت بڑھانے پر بھی زور دیا۔ بیرونِ ملک مارکیٹ شیئر حاصل کرنا آسان نہیں کیونکہ اِس کے لیے برانڈز تیار کرنا پڑتے ہیں اور اس کے لیے بیرونِ ملک مضبوط ٹیموں کو ٹاسک دینے کی ضرورت ہے۔ ایسی تمام ٹیموں کو معقول مالیاتی وسائل میسر ہونے چاہئیں تاکہ بروقت خرچ کرکے برآمدی ہدف کا حصول یقینی بناسکیں۔

ان تمام چیلنجوں کا ڈھنگ سے سامنا کرنے کے لیے پی پی ایم اے کی سابق چیئرپرسن کی تجویز ہے کہ بیرونِ ملک ادائیگیاں یقینی بنانے کے لیے زرِمبادلہ کا ریٹینشن ریٹ ۱۵؍فیصد سے بڑھا کر ۳۵ فیصد کردیا جائے۔ اس کے لیے انہوں نے بھارت کے فارما ایگزل کی طرز پر مارکیٹ ڈیولپمنٹ اسسٹنس سسٹم بھی تجویز کیا ہے۔

پی پی ایم اے کی سابق چیئرپرسن نے یہ بھی بتایا کہ فارما سیکٹر کے بنیادی اجزا (خام مال) پر ۲۰ فیصد پروٹیکٹیو ڈیوٹی کے نفاذ سے فارما انڈسٹری کو پروان چڑھانے میں مشکلات کا سامنا ہے۔ اس ڈیوٹی کا مقصد مقامی ایورتج پرائس انڈیکس (اے پی آئی) پر پروڈکشن بڑھانے کے لیے کام کرنا ہے تاہم اس کے نتیجے میں دواسازی کی لاگت بڑھ رہی ہے اور پاکستانی دواؤں کے لیے بیرونی منڈیوں میں مسابقت کی گنجائش نہیں رہی۔ مثلاً پاکستان میں پیراسیٹامول کے لیے اے پی آئی چین کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ یوں عالمی منڈی میں پاکستان کی تیار کردہ پیراسیٹامول کے لیے مقابلہ ممکن نہیں رہا۔

سرکاری عہدیدار کا کہنا ہے کہ حکومت درآمدی ڈیوٹی بڑھانے کے بجائے فارماسیکٹر کے لیے زرِ اعانت اور ترغیبات کا اعلان کرے۔ حکومت مقامی اے پی آئی پروڈکشن کی استعداد بڑھانے کے اقدامات کرے اور اِسی بنیاد پر پالیسی فیصلے کیے جائیں۔ مضبوط سپلائی چین بھی لازم ہے اور ساتھ ہی ساتھ صنعت کاروں کے لیے خام مال کا حصول بھی آسان بنایا جانا چاہیے۔ بیرون ملک طویل المیعاد منصوبوں کے لیے خام مال کا معقول بہاؤ لازم ہے۔

اعلیٰ سرکاری عہدیدار کا کہنا تھا کہ بیرونی مارکیٹ میں بالعموم سات سال تک کے معاہدے کیے جاتے ہیں۔ ایسے میں ہمارے دواساز اداروں کے لیے مستحکم سپلائی چین ہونی چاہیے، خام مال وافر مقدار میں دستیاب ہونا چاہیے۔ اس معاملے میں مقامی اے پی آئیز پر بھروسا کرنا جو اکھیلنے کے مترادف ہے۔

پاکستان کو اس وقت زرمبادلہ کی اشد ضرورت ہے۔ ایسے میں برآمدات بڑھانے سے زیادہ معقول آپشن نہیں۔ پاکستان جیسی بڑی معیشت کے لیے استحکام لازم ہے مگر چند برسوں کے دوران ڈالر کے مقابلے میں پاکستانی روپے کی قدر میں رونما ہونے والی متواتر گراوٹ کے باوجود برآمدات میں خاطر خواہ اضافہ ممکن نہیں بنایا جاسکا ہے۔ ماہرین کہتے ہیں کہ فارماسیکٹر کے علاوہ بھی کئی شعبے میں جن میں برآمدات کو فروغ دے کر زرِمبادلہ کا حصول یقینی بنایا جاسکتا ہے۔

باقی صفحہ نمبر ۱۱

امریکا کے لیے پھر خطرے کی گھنٹی بج گئی؟

ابو صباحت

چین اور مغرب کے درمیان فضائے تجارت کا درجہ حرارت بلند تر ہوتا جارہا ہے۔ چین کی انتہائی غیر معمولی مینوفیکچرنگ صلاحیت نے امریکا اور یورپ کے لیے انتہائی نوعیت کا دردِ سر پیدا کیا ہے۔ اِن دونوں خطوں کی سمجھ میں نہیں آرہا کہ اب کس طور چین کا ڈھنگ سے سامنا کیا جائے اُسے تجارت کے اکھاڑے میں پچھاڑا جائے۔ بعض معاملات میں چین کو پیچھے رکھنے کی کوشش تھوڑی سی کامیاب ہوئی ہے مگر اب چینی حکمتِ عملی کُھل کر سامنے آرہی ہے۔

امریکا اور یورپ نے ایک مدت تک افریقا کو نظر انداز کیا۔ اِس پورے براعظم کو خانہ جنگیوں میں الجھا کر رکھ گیا۔ صدیوں کی پسماندگی نے افریقا کو اِس بُری طرح لپیٹ میں لے رکھا ہے کہ اس کے بیشتر حصوں کے لیے باقی دنیا سے ہم آہنگ ہونا اور قدم ملا کر چلنا اب تک ممکن نہیں ہو پایا۔ مشرقِ وسطیٰ سے جڑے ہوئے اور عربی بولنے والے چند افریقی ممالک کے سوا اِس پورے براعظم کے لیے ترقی کا خواب اب تک خواب ہی ہے۔ ایسے میں چین نے آگے بڑھ کر اس خطے کا ہاتھ تھاما ہے۔ چین نے افریقا بھر میں معدنیات اور زراعت کے حوالے سے غیر معمولی سرمایہ کاری کی ہے۔ یہ عشروں کے عمل کا نتیجہ ہے۔

چین کی بڑھتی ہوئی معاشی قوت اور افریقا میں اُس کے تیزی سے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ سے امریکا اور یورپ انتہائی پریشان ہیں۔ ایسے میں اُن کے پاس صرف بگاڑ پیدا کرنے کا آپشن رہ گیا ہے اور یہی آپشن وہ استعمال بھی کر رہے ہیں۔ چین کی بڑھتی ہوئی معاشی قوت کی راہ میں دیواریں کھڑی کرنے کی کوششیں پے در پے ناکامی سے دوچار ہوتی جارہی ہیں۔ امریکا اور یورپ کے لیے مینوفیکچرنگ کے شعبے میں چین سے مقابلہ کسی بھی طور ممکن نہیں رہا۔ ایسے میں صرف یہ آپشن رہ گیا ہے کہ چین کو کسی نہ کسی طور تنازعات میں الجھایا جائے۔ دونوں چاہتے ہیں کہ چین کسی بڑی جنگ میں ملوث ہو۔ یہی سبب ہے کہ بحیرہ جنوبی چین میں معاملات کو الجھانے کی کوششیں کی گئی ہیں۔ جنوب مشرقی ایشیا کی بعض ریاستوں کو چین کے مقابل لانے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ تائیوان کے معاملے میں امریکا کوشاں رہا ہے کہ کسی نہ کسی طور چینی قیادت مشتعل ہوکر، جذبات کی رَو میں بہتے ہوئے کچھ ایسا کر گزرے کہ خطے کی سلامتی داؤ پر لگے اور اس صورتِ حال میں چین کے لیے معیشت میں بالعموم اور ہائی ٹیک میں بالخصوص پیش رفت آسان نہ رہے۔

امریکا اور یورپ کی حکمتِ عملی کو ناکام بنانے کے لیے اب روس بھی میدان میں آچکا ہے۔ یوکرین جنگ نے ثابت کردیا ہے کہ روس نے طے کرلیا ہے کہ اُسے اور چین کو دیوار سے لگانے کی امریکا اور یورپ کی کسی بھی کوشش کو آسانی سے کامیاب نہیں ہونے دیا جائے گا۔ یوکرین پر روس کی لشکر کشی بظاہر بلا جواز ہے مگر یہ معاملہ اخلاقی اعتبار سے تو غلط ہوسکتا ہے، اسٹریٹجک نقطۂ نظر سے بالکل غلط نہیں۔ امریکا کو چین کے پڑوس میں تائیوان کی فکر لاحق ہے تو روس کو اپنے پڑوس میں واقع یوکرین میں امریکا اور یورپ کی مداخلت کس طور گوارا ہو؟ امریکا دنیا بھر میں پیر پسارے رہتا ہے۔ یہی روش اگر کوئی اور اپنائے تو اُس سے برداشت نہیں ہو پاتا۔ ماہرین کہتے ہیں کہ امریکی فوج over-stretched ہے یعنی اُس نے اپنے سَر پر کچھ زیادہ ہی بوجھ لاد رکھا ہے۔ ایسے میں اگر کوئی اور ملک عسکری نقطۂ نگاہ سے کوئی تجربہ کرنا چاہے تو امریکا اور یورپ مل کر اُس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔

روس اور چین نے اسٹریٹجک پارٹنرشپ کو مزید توسیع دی ہے۔ دونوں ممالک نے علاقائی اور عالمی سطح پر اپنے کردار کو وسعت دینے پر بھی اتفاق کرلیا ہے۔ روسی صدر ولادیمیر پوٹن کے چین کے حالیہ دورے میں چند نئے معاہدوں پر دستخط کیے گئے ہیں۔ روس چاہتا ہے کہ چین سے اسٹریٹجک پارٹنرشپ کو اس حد تک بڑھایا جائے کہ امریکا اور یورپ خائف ہوں۔

امریکا چاہتا ہے کہ چینی مصنوعات پر زیادہ سے زیادہ درآمدی ڈیوٹی لگائی جائے تاکہ امریکی صنعتیں تباہی سے محفوظ رہیں۔ یورپ میں چین کی سستی برقی گاڑیوں نے ہنگامہ برپا کر رکھا ہے۔ جرمنی، فرانس اور برطانیہ کے آٹو میکر پریشان ہیں کہ چین کی خاصی سستی برقی گاڑیوں کا سامنا کیسے کریں۔

چین نے برقی گاڑیوں کی بیٹریوں کا مسئلہ بھی بہت حد تک حل کرلیا ہے۔ امریکا نے لاگت میں کمی کی تمام کوششوں کے ناکام ہونے پر اب چین کی برقی گاڑیوں پر ۱۰۰ فیصد درآمدی ڈیوٹی لگادی ہے۔

امریکا نے کہا ہے کہ روس اور چین مزید قربت پیدا کرنا چاہتے ہیں کریں، ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ امریکا کی قومی سلامتی کونسل کے ترجمان جان کربی نے میڈیا بریفنگ میں کہا کہ چین اور روس کے صدور کو وضاحت کرنی چاہیے کہ وہ کیوں گلے ملے۔ واضح رہے کہ دونوں صدور کے معانقے کی وڈیو وائرل ہوئی ہے۔

روسی صدر پوٹن کا چین کا دورہ امریکا اور یورپ دونوں ہی کے لیے پریشان کن ہے۔ روس معاشی کردار میں توسیع چاہتا ہے جبکہ چین اُسے عسکری معاملات میں شریک کرکے اپنے اثر و رسوخ کا دائرہ وسیع تر کرنا چاہتا ہے۔ معاہدوں پر دستخط کے بعد روس اور چین کے صدور کا معانقہ غیر معمولی اشارہ ہے۔

مسلسل چھٹی بار صدر منتخب ہونے کے بعد پہلے غیر ملکی دورے کے لیے چین کا انتخاب کرکے صدر پوٹن نے امریکا اور یورپ دونوں ہی کو پیغام دیا ہے کہ اُن کے لیے خطرے کی گھنٹی بج چکی ہے۔ یوکرین جنگ میں امریکا کا بڑھتا ہوا کردار روس کو مزید ناراض کرنے کا باعث بنا ہے اور اُس نے خود کو چین سے مزید قریب کرنے کا فیصلہ کرکے پیغام دیا ہے کہ اب نئے عالمی نظام کی ضرورت ہے جس میں روسی اور چینی کردار بھی غیر معمولی حد تک نمایاں ہو۔

یوکرین کی جنگ عجیب موڑ پر ہے۔ روس مکمل فتح کا دعویٰ کرنے کی پوزیشن میں نہیں۔ دوسری طرف یوکرین بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اُس نے سابق سپر پاور کو پچھاڑ دیا ہے۔ روسی قیادت پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں۔ یہ اُس کے لیے بہت حد تک انا کا مسئلہ ہے مگر اس بہانے وہ امریکا اور یورپ کو پیغام بھی تو دینا چاہتی ہے کہ چاہے کچھ ہوجائے، اب وہ عالمی سطح پر اپنے آپ کو منوا کر ہی دم لے گا۔ روسی صدر ولادیمیر پوٹن چاہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طور روس کو دوبارہ عالمی سیاست کے ایک بڑے کھلاڑی میں تبدیل کریں۔ اس کے لیے وہ کسی بھی حد تک جانے کے لیے تیار ہیں۔

خاصی خوش گوار حقیقت یہ ہے کہ روس نے ایک طرف تو اپنے پڑوسیوں یعنی وسطِ ایشیا کی ریاستوں سے تعلقات نہیں بگاڑے اور دوسری طرف مسلم دنیا سے بھی بات بنا کر چل رہا ہے۔ جنوبی ایشیا میں بھی روس کے حوالے سے اچھا تاثر پایا جاتا ہے۔

اب امریکا اور یورپ کو اپنے لیے نیا راستہ چُننا ہے۔ اُنہیں دیکھنا ہے کہ روس اور چین کی مشترکہ قوت کا سامنا کرنے کی اُن میں کتنی سکت ہے۔ چین کی معاشی قوت کے بارے

باقی صفحہ نمبر ۱۲

MA'ARIF FEATURE - Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950